ہمارا ہندوستان

منو مسانی

۹ھ

۹۵۲

ع

ھ ۷۷

عصمت اللہ بیگ مرزا

ہمارا ہندُستان

مع ایک سو (۱۰۰) اشکال

از مِنو مسانی

مترجمہ
مرزا عصمت اللہ بیگ

OUR INDIA (HAMARA HINDUSTAN)

by Minoo Masani

Translated into Urdu by Mirza Asmatullah Beg

Illustrated by C. H. G. Moorhouse

PRINTED IN INDIA AT THE
DIOCESAN PRESS, VEPERY, MADRAS—1943. L8778.

دیباچہ

آج کل ہندُستان کی مُختلف زبانوں میں اتنے ترجمے شائع ہو رہے ہیں کہ یہ شُبہ ہو سکتا ہے کہ ترجمہ کرنا بہت آسان ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا ترجمہ جس کو سب پسند کریں ایک بُہت ہی مشکل کام ہے۔ ترجمے میں ایک بڑی دقّت یہ ہے کہ ہر شخص اپنے ذاتی رجحان کے لحاظ سے لفظوں اور بندشوں کا انتخاب کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مقدّس اور مستند کتابوں کے متعدّد ترجمے ہو چکے ہیں اور اب بھی برابر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اصل اور ترجمے میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ اصل کا مطلب کس حد تک صحت کے ساتھ ترجمے میں ادا کیا گیا ہے ؂

مسٹر مِنّو مسانی کی کتاب "ہمارا ہندُستان" (Our India) کا تصحیح شدہ جو آخری ایڈیشن نکلا ہے وہ نہ صرف اپنے مضامین بلکہ اپنی طرزِ تحریر کے لحاظ سے بھی ایک خصوصیت رکھتا ہے۔ انگریزی زبان میں وہ مضمون بآسانی ادا ہو سکتا ہے جو اِس کتاب میں ناظرین کی غور و فکر کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اردو زبان کے لیے یہ ایک نئی چیز ہے، اس لیے بعض جگہ مُجھے تصرّف سے بھی کام لینا پڑا ہے؛ مثلاً ایک باب کا عنوان ہے (The House of Cards) جس کا ترجمہ "کاغذ کی ناو" کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ میں نے حتّی الوسع کوشش کی ہے کہ اردو زبان میں مصنّف کا مطلب اُسی طرز میں ادا کیا جائے جس طرح مصنّف نے انگریزی زبان میں ادا کیا ہے۔ اب میں اپنی

کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا اِس کا صحیح تصفیہ آپ ہی فرما سکتے ہیں ؛

اِس ترجمے کی طباعت میں اُن جدید تجاویز کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے جو اردو کے ادیبوں نے پیش کی ہیں اور ترقّی پسند اصحاب نے اُنھیں اختیار کر لیا ہے۔ مثلاً:

مروّجہ		مصحح
کنواں ، گاؤں ، چھاؤں ، پاؤں	کی بجائے	کنوا ، گانو ، چھانو ، پانو
تمہارا ، تمہیں ، انہیں ، جنہیں	"	تمھارا ، تمھیں ، انھیں ، جنھیں
گذشتہ ، گذر ، گذارش ، گذارہ	"	گزشتہ ، گزر ، گزارش ، گزارہ
جسدن ، اسقدر ، مجھسے ، جسکو	"	جس دن ، اس قدر ، مجھ سے ، جس کو
شائد ، نمائندہ ، جائیداد ، نمائش	"	شاید ، نمایندہ ، جایداد ، نمایش
کئے ، لئے ، چاہئے ، لیجئے	"	کیے ، لیے ، چاہیے ، لیجیے
گائے ، رائے ، بھاؤ ، ناؤ	"	گاے ، راے ، بھاو ، ناو
چھ بچّے مدرسہ گئے	"	چھے بچّے مدرسے گیے
پہونچ ، کچھہ	"	پہنچ ، کچھ
معہ ، بابتہ ، عیوض ، ہندوستان	"	مع ، بابت ، عوض ، ہنُدستان

میں آخر میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس (انڈیا) کا شکرگزار ہوں کہ اُس نے نہ صرف میرے ترجمے کو قبول کیا بلکہ لکھائی چھپائی کا ایسا اچھا انتظام کیا کہ یہ سبق آموز کتاب اپنے انگریزی ایڈیشن سے ہمسری کرنے لگی اور اِس کی دیدہ زیب طباعت اور جاذبِ نظر تصویروں نے اردو کی مطبوعات کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ پیش کر دیا ؛

میں اپنے اُن دوستوں کا بھی اور خاص کر مولوی سجّاد مرزا صاحب پرنسپل

عثمانیہ ٹریننگ کالج حیدر آباد دکن کا شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے اپنے قیمتی مشوروں، اصطلاحات کے انتخاب اور ضروری ترمیمات میں خاص طور پر مدد دی جس سے یہ کتاب سیدھی سادی بول چال اور سلیس اور عام فہم زبان میں ترجمہ ہوسکی۔

جوبلی ہل - حیدر آباد دکن
یکم مئی ۱۹۴۲ء

مترجم
مرزا عصمت اللہ بیگ

فہرستِ مضامین

ہندستان

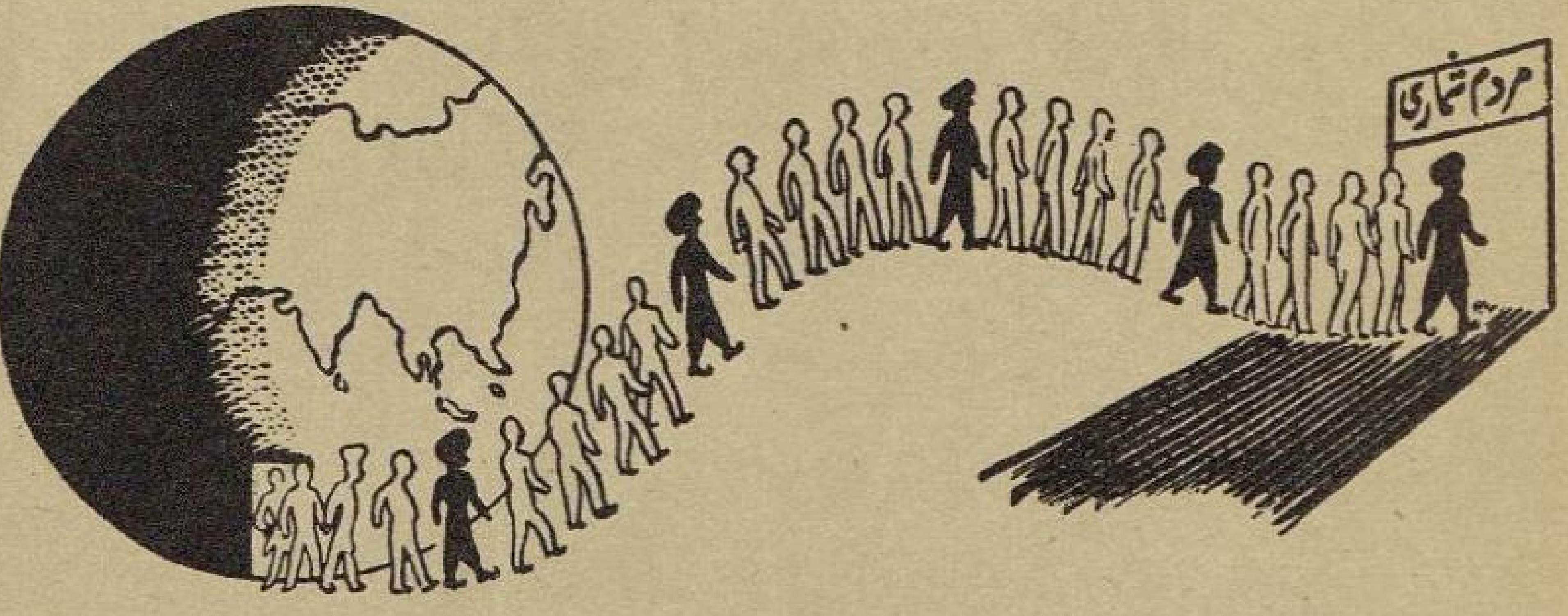
اے مرے دارالاماں ، جنّت نشاں ہندوستاں
کس قدر دلچسپ اور دِلکش ہے تیری داستاں
قدرۃً کوہِ ہمالہ تیرے سر کا تاج ہے
رفعت و عظمت سے جس کی سرنگوں ہے آسماں
چوٹیوں پر برف ، اُس پر مہرِ رخشاں کی شعاع
دیکھ کر ہوتا ہے اِک تاجِ مرصّع کا گماں
ہے کمر پر تیرے پٹکا بندھیا چل کوہ کا
نربدا آنچل کی صورت اُس کے دامن میں رواں
پائے بوسی رات دن کرتا ہے تیری بحرِ ہند
دستِ چپ برما ہے اور دستِ یمیں افغاں ستاں
ہے مربّع میل میں رقبہ جو تیرا بیس لاکھ
اِس سے تیری شان و شوکت اور رفعت ہے عیاں
چار سو ملین کے لگ بھگ لوگ یاں آباد ہیں
جو کہ ہے دُنیا کی آبادی کا حِصّہ پانچواں

(عصمت)

پہلا باب

پانچ میں ایک

دُنیا کے ہر پانچ آدمیوں میں ایک ہندُستانی ہے۔ باقی چار میں ایک امریکی، ایک یوُرپی، ایک حبشی اور ایک چینی سمجھ لو۔ یہاں اُن کی گنتی ہو رہی ہے ۔



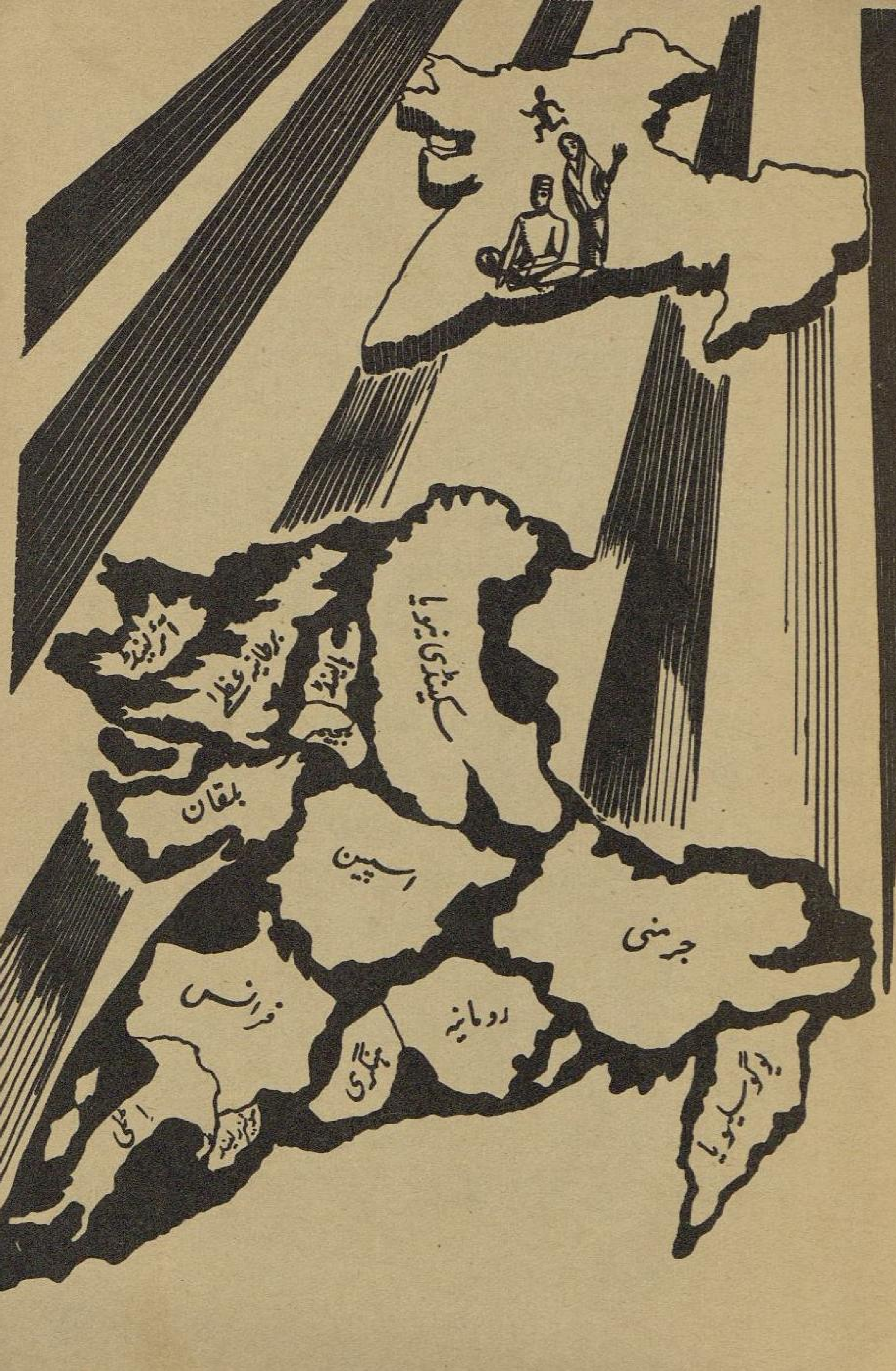
کیا اِس سے تُمھیں اپنی بڑائی نہیں محسوس ہوتی ؟ کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ دُنیا بھر کے اِنسانوں کا پانچواں حصّہ ہمارے ہندُستان میں ہے۔ اور یہ کہ چین کو چھوڑ کر ہمارے مُلک میں

سب سے زیادہ لوگ آباد ہیں ؛ اِتنی بڑی آبادی اور اِتنا بڑا رقبہ ہونے پر بھی کیا ہمارا یہ اِحساس غلط ہے کہ دُنیا کے مُعاملات میں حِصّہ لینے کا اور اُس کی گُتھیاں سُلجھانے کا ہمیں بھی حق ہے ؟

دیکھو تو کہ ہمارا مُلک کِتنا بڑا ہے ! اِس کا پھیلاؤ مشرق سے مغرب تک دو ہزار میل ہے اور شمال سے جنُوب تک بھی دو ہزار میل ہے ۔ اِس کا رقبہ تقریباً بیس لاکھ مربّع میل ہے ۔ اور یہ رقبہ رُوس کو چھوڑ کر پُورے برِّاعظم یوُرپ کے رقبے کے برابر ہے ۔ دوُسرے صفحے پر جو نقشہ ہے اُس سے یہ بات اور اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے ۔

ہندُستان کے ایک معمُولی ضلع کا رقبہ بھی تقریباً چار ہزار مُربّع میل ہوتا ہے ۔ اور ہمارے ہاں کے کئی ضلعے تو یوُرپ کے بعض پوُرے پوُرے مُلکوں کے برابر ہیں ! مثلاً : مدراس کے ضلع وزیگاپٹم کا رقبہ اور آبادی دونوں ڈنمارک کے رقبے اور آبادی سے زیادہ ہیں ۔ بنگال کے ضلع میمن سنگھ کی آبادی سوئٹزرلینڈ کی آبادی سے زیادہ ہے ۔ اور بہار کے تعلقۂ ترہٹ کی آبادی کینیڈا کی "بڑی" نوآبادی سے زیادہ ہے !

سوچنے کی بات ہے کہ دُنیا میں کئی چھوٹے مُلک ہیں ۔ ہندُستان سے بھی بہت چھوٹے ۔ مگر پھر بھی اُن کے حالات سے تاریخوں اور اخباروں کے صفحے رنگے ہوتے ہیں اور اُن کی ایک ایک چیز کو کھول کھول کر بتایا جاتا ہے ۔ دوُر


آئرلینڈ
برطانیہ عظمیٰ
ہالینڈ
بیلجیم
سکینڈی نیویا
بلقان
اسپین
جرمنی
فرانس
رومانیہ
ہنگری
اٹلی
سوئٹزرلینڈ
یوگوسلاویا

کیوں جاؤ اپنے اِسکول اٹلس کے چند نقشوں کو دیکھو۔ اِن میں ہمارے وطن کا غلط تصوّر پیش کیا گیا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ جان بوجھ کر کیا گیا ہے یا بے جانے بوُجھے! مگر یہ ضرور ہے کہ اِس بے تُکے تصوّر کے سبب سے دُنیا میں ہماری بڑائی اور اہمیت بہُت گھٹ گئی ہے۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ ایک نقشے میں تو ہندُستان کو آدھے اِنگلستان کے برابر دِکھایا گیا ہے؟

صرف رقبہ یا وُسعت ہی کوئی چیز نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ وُسعت سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟ وُسعت میں فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی۔ اِس کی وجہ سے ہم کو بڑی بڑی مُشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بڑے بڑے مسئلوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی مُمکن ہو جاتا ہے کہ ہم بڑے پیمانے پر کام کر سکیں۔

ہم ہندُستانیوں کی مثال ایک ایسے زمیندار کے مانند ہے جس کی زمین بہت بڑی ہو۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ یہ زمین کِس جگہ ہے اور اِس کی جائے وقوع کیسی ہے؟ کیا آس پاس کی دوُسری زمینوں سے الگ کرنے کے لیے اُس کے حدوُد بھی بنے ہیں یا نہیں؟ کیا یہ کسی شاہراہ پر واقع ہے یا کسی ایسے دُور دراز گوشے میں ہے جہاں پہنچنے کے لیے اندھیری سڑکوں اور چکّر دار گلیوں میں سے جانا پڑتا ہے؟

دوسرے بڑے مُلکوں کے مقابلے میں قُدرت نے ہندُستان کو ایسے قُدرتی حُدوُد عطا کیے ہیں جن سے وُہ بہت زیادہ محفوظ ہوگیا ہے۔ مشرق، جنوب اور مغرب میں اُسے ایک وسیع اور گہرا سمندر

گھیرے ہُوا ہے۔ شمال میں ہمالیہ کے بلند پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے جو خشکی کی سرحد پر ایک سِرے سے دُوسرے سِرے تک پھیلا ہُوا ہے۔ دُشمنوں کو روکنے کے لیے کیا اِس سے زیادہ مضبوط اور کوئی "سیج[1] فرائڈ لائن" (Siegfried Line) ہو سکتی ہے *

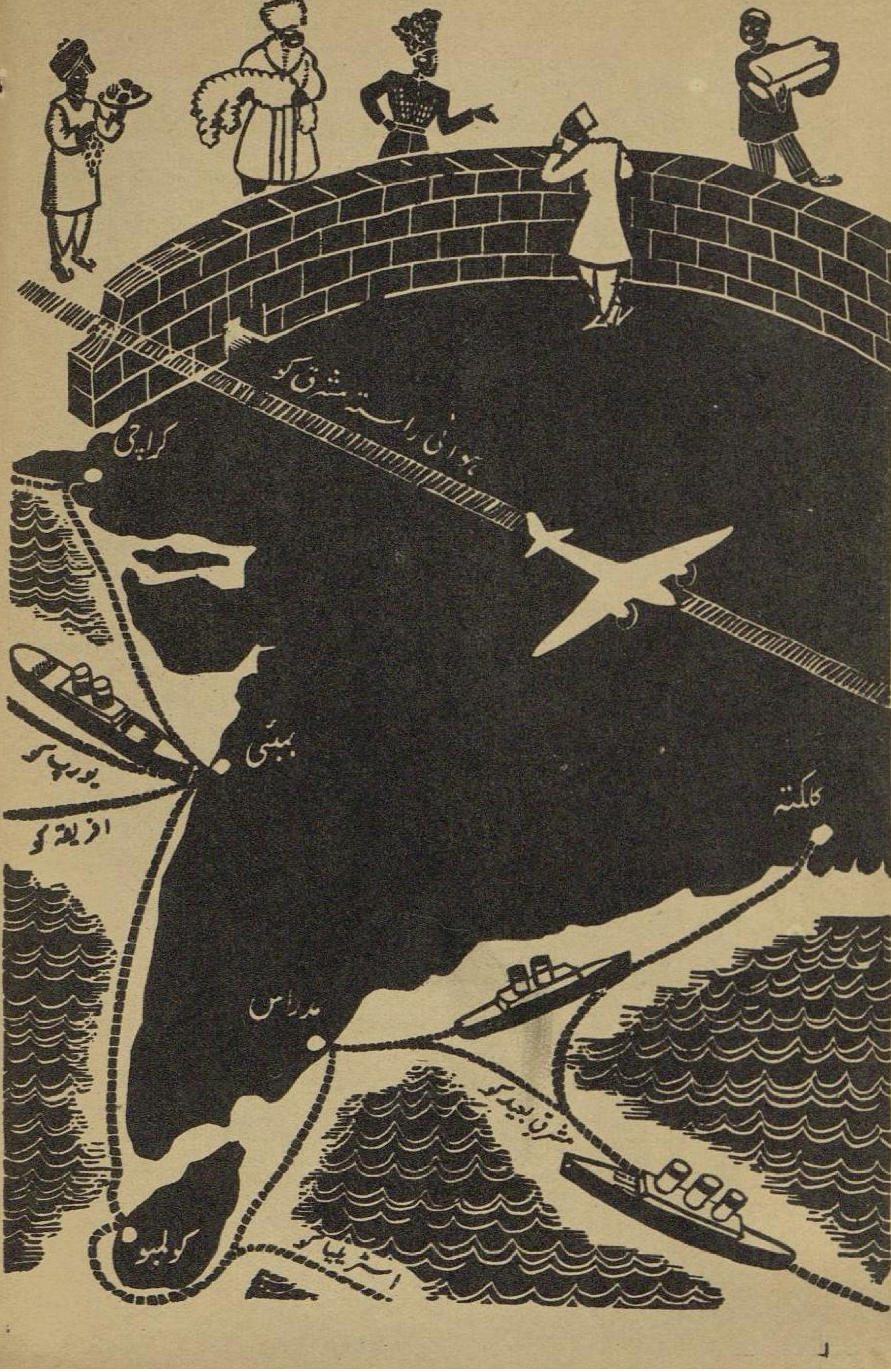
اِن پہاڑوں پر سے دُشمن چڑھ کے آ سکتا نہیں
اِک قدم بھی یعنی سرحد میں بڑھا سکتا نہیں

اگرچہ ہم اِس طرح بالکل الگ اور محفوظ ہو گئے ہیں پھر بھی باقی دُنیا سے بے تعلق نہیں ہوئے۔ بلکہ ہم ٹھیک قُدرت کی شاہراہ پر ہیں: یعنی ہندستان اُن بحری اور برّی تجارتی رستوں پر واقع ہے جو یوُرپ، مشرقِ قریب سے مشرقِ بعید اور آسٹریلیا کو جاتے ہیں۔ اِس لیے ہندُستان کے لوگ چین، جاپان، سیام، ملایا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، مشرقی اور جنوبی افریقہ، بحیرۂ رُوم کے ساحلی مُلک، یوُرپ، رُوس، ایران، عراق اور افغانستان وغیرہ سے بہ آسانی تجارت کر سکتے ہیں *

آؤ، اب ذرا دیکھیں کہ ہماری سرحدوں کے اندر کیا کیا ہے اور ہمارا مُلک کِس قسم کا ہے؛ جن لوگوں نے زمین کی ساخت یعنی بناوٹ اور اُس کی اندرونی حالت کا مطالعہ کیا ہے اُن کا بیان ہے کہ ہندُستان تین بڑے حِصّوں میں مُنقسم ہے: پہلے تو جنوب میں جزیرہ نما کی وُہ سطحِ مُرتفع ہے جو ہندُستان کا سب سے قدیم اور پتھریلا حِصّہ ہے۔ مشرق میں بندھیا چل اور ستپوُرا پہاڑوں کے

---

[1] جرمنی کی سرحد پر جو قلعہ بندیاں ہیں۔ اُس کا نام سیج فرائڈ لائن ہے *



ہوائی راستہ مشرق کو
کراچی
بمبئی
یورپ کو
افریقہ کو
کلکتہ
مدراس
مشرق بعید کو
کولمبو
آسٹریلیا کو

سلسلے کاٹھیاوار سے شروع ہوتے ہیں اور جنوبی جزیرے نما کو بقیہ ہندُستان سے جُدا کرتے ہیں۔ پھر شمال میں کوہ ہمالیہ کا پہاڑی علاقہ ہے جس میں دُنیا کے سب سے اونچے پہاڑ ہیں۔ بعض عالموں کا خیال ہے کہ ہمالیہ پہاڑ کا سلسلہ اب بھی آہستہ آہستہ اونچا ہوتا چلا جا رہا ہے! اُن کا بیان ہے کہ ہندُستان میں جو زلزلے آتے ہیں جیسے کہ بہار میں آئے تھے، اُس کی وجہ یہی تھی۔

اِن دونوں کے بیچ میں تیسرا حصّہ ہے۔ سندھ گنگا کا میدان۔ جو مغرب میں دریائے سندھ کی وادی سے شروع ہوکر مشرق میں دریائے برہم پُتر تک چلا گیا ہے۔ یہاں کی زرخیز زمین زراعت کے لیے بہت موزوں ہے۔ یہ ہمارے مُلک کا سب سے نیا حصّہ ہے۔ بہت زمانے تک وہ سمندر میں ڈوبا ہُوا تھا اور ہمارا جنوبی جزیرہ نما دراصل ایک جزیرہ تھا۔ شمال کے بڑے دریا ہمالیہ کے پہاڑوں سے مٹّی بہاکر لائے اور اندرونی سمندر میں ڈالتے رہے۔ اِس طرح بہت ہی آہستہ آہستہ سمندر کی تہ ابھرتی رہی؛ دریا مٹّی لےکر ذرا اور آگے بڑھے اور جہاں وہ مٹّی جمع کر سکتے تھے وہاں مٹّی کا ڈھیر لگا دیا۔ اِس طرح سندھ اور گنگا کا بڑا میدان تیّار ہوا۔ اب یہ جزیرہ نما جزیرہ نہ رہا۔ درمیان کی جگہ بھر گئی اور جنوبی ہندُستان کا جزیرہ نما شمالی میدان کی وجہ سے ایشیا کے پہاڑوں سے مِل گیا جو دُنیا کے سب سے زیادہ زرخیز حصّوں میں سے ہے۔

ہمالیہ پہاڑ کا ہمارے مُلک پر بہت بڑا اثر ہے۔ اُس کا پہلا اثر ہماری آب و ہوا اور ہماری زمین پر ہے۔ ہمالیہ وسطی ایشیا

کی خشک ہواؤں کو روکتا ہے اور ہندُستان میں ریگستان کے سے حالات نہیں پیدا ہونے دیتا ورنہ ہندُستان کی حالت بھی وسطی ایشیا کی طرح ہو جاتی۔ اِس لحاظ سے ہم اِن پہاڑوں کے احسان مند ہیں جن کے سبب اِس مُلک کی آب و ہوا اِس قدر عُمدہ ہے کہ ایک انگریز نے یہ بیان کیا ہے کہ پورے ہندُستان کا موسم سال میں چند مہینے اور چند حصّوں کا موسم پورے سال تک نہایت خوشگوار رہتا ہے۔

دُوسرے ہم پُوچھتے ہیں کہ ہندُستان کے بڑے بڑے دریا کہاں سے نکلتے ہیں؟ ہمالیہ سے۔ چنانچہ دریاے سندھ، گنگا اور برہم پُتر کے منبعے یا سرچشمے بھی ہمالیہ کی گھاٹیوں میں واقع ہیں۔ یہ سب دریا شمالی ہندُستان کے لوگوں کے لیے پانی مہیا کرتے ہیں، زمین سیراب کرتے ہیں اور حمل و نقل کے ذرائع کا کام دیتے ہیں۔ اِس کے عِلاوہ وہ اب بھی چکنی مٹّی لاکر زمین پر ڈالتے ہیں اور اُس کی زرخیزی بڑھاتے رہتے ہیں۔

اِن بڑے دریاؤں کو پہاڑوں سے سمندر تک ہمیشہ جاری رکھنے کے لیے قُدرت نے ہمارے واسطے ایک ایسا ہی تعجب خیز کام کیا ہے جیسا کہ الہ دین کے چراغ کا جن کرتا تھا۔ یہ جن ہمارا پُرانا دوست مان سُون ہے۔ یہ ہر سال کے وسط میں جیسا کہ تم دُوسرے صفحے کی تصویر میں دیکھتے ہو۔ سُورج، بادل، ہوا اور بارش کے عمل سے سمندر سے اِس قدر پانی پہاڑ کی چوٹیوں پر لے جاتا ہے کہ جس کا اندازہ کرنا بھی غیر مُمکن ہے۔ اِس کے عِلاوہ وہ ہندُستان

کے خشک اور کھلے ہوئے میدانوں کو بھی سیراب کرتا ہے۔

مان سون کے بعد ہندستان کی سب سے نمایاں خصوصیت اُس کی آب و ہوا، اُس کی زمین اور اُس کے باشندوں کا بے حد اختلاف ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اِس لیے کہ راس کماری خطِ اِستوا سے صرف ۸ درجے شمال میں ہے اور گلگت کشمیر میں ۳۴ درجے

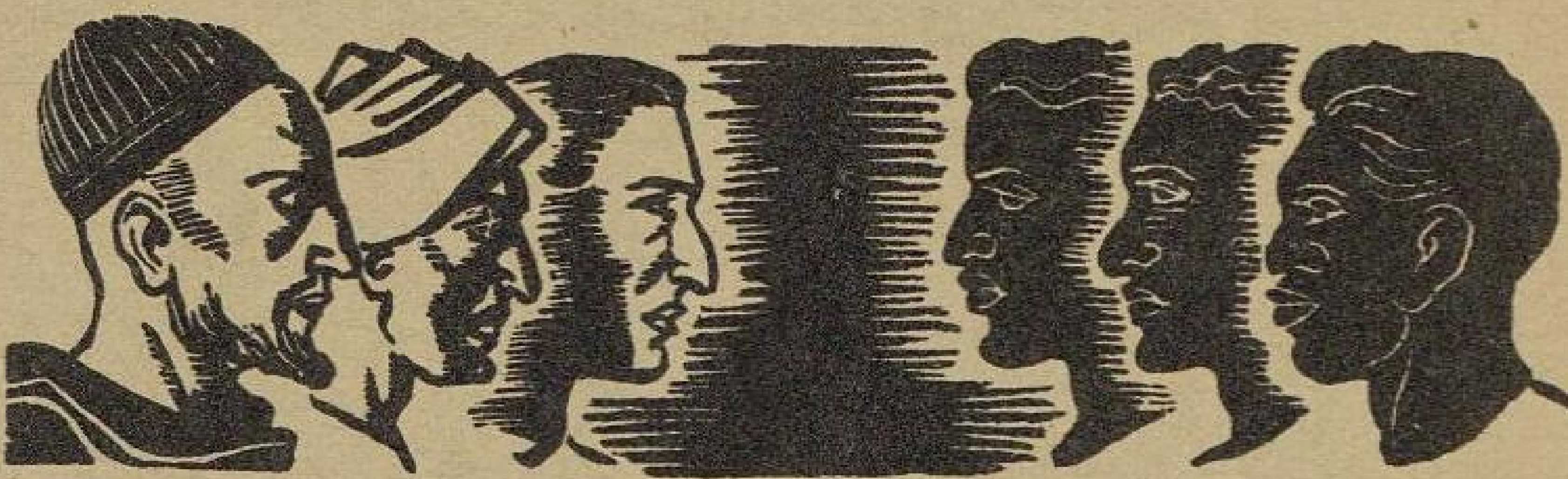


شمال میں ہے۔ ہندُستان میں ہر قسم کی آب و ہوا پائی جاتی ہے۔ ایک طرف تو تپتے ہوئے میدان ہیں جن میں افریقہ کے گرم سے گرم حصّوں کی سی گرمی پائی جاتی ہے۔ جیکب آباد (سندھ) میں گرمی کے زمانے میں حرارت ۱۲۵ درجے تک پہنچ جاتی ہے۔ اور دُوسری طرف ہمالیہ کے خطّے میں بحرِ منجمد کی سی سردی ہوتی ہے۔ اور پارہ نقطۂ انجماد (freezing-point) سے بھی نیچے گِر جاتا ہے۔ اِسی طرح ایک طرف تو چراپونجی ہیں۔ جو آسام کی پہاڑیوں میں واقع ہے۔ سال بھر میں ۴۶۰ اِنچ بارش ہوتی ہے اور دُوسری طرف سندھ کے بالائی علاقوں میں صرف تین اِنچ ہی ہوتی ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں پُورے آٹھ مہینے خشک ہوتے ہیں اور اُس کے بعد پُورے چار مہینے مسلسل بارش کے آتے ہیں۔ اِسی طرح ہمارے ہاں سندھ گنگا کا زرخیز میدان بھی ہے جہاں تقریباً ہر قسم کی پیداوار ہو سکتی ہے اور منطقۂ حارّہ (tropical forest) کے گھنے جنگل بھی ہیں جو جزیرہ نما کے کنارے کنارے دُور تک چلے گئے ہیں؛ جیسے کہ ملیبار میں۔ لیکن اِسی کے ساتھ راجپوتانے، سندھ اور کچھ کے خشک اور ریگستانی علاقے بھی ہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی آدمی کی صُورت دیکھتے ہی ہم یہ کہہ دیتے ہیں "ہمیں اِس آدمی کی شکل پسند نہیں"! یا "بھئی وُہ آدمی تو بھلا مانس معلوم ہوتا ہے"! کیوں؟ اِس لیے کہ قدرتاً ہمیں اِحساس ہو جاتا ہے کہ اِس صُورت شکل کا آدمی کبھی اچھا نہیں ہو سکتا یا دُوسرا شخص جو ایک خاص ادا سے دیکھتا ہے وُہ بہت ہی اچھا ہوتا ہے۔ اور سچ پُوچھو تو اِس قسم کا اِحساس اکثر صحیح ہوتا ہے اور کبھی غلط

بھی ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اِنسان کی کیفیت اُس کے چہرے اور رنگ رُوپ سے بہت کچھ ظاہر ہو جاتی ہے ۔

اِسی طرح کسی مُلک کی زمین، پہاڑ، دریا اور آب و ہوا اُس کے چہرے کے مانند ہیں اور اُس کے باشندے یعنی مرد اور عورتیں اُس کا دل و دماغ ہیں۔ لیکن ہندُستان کی حد تک یہ عمل اُلٹ گیا ہے۔ کیونکہ اِس مُلک کی موجُودہ شکل و صوُرت کی ساخت کے بہُت زمانے بعد لوگ اِس میں آکر بسے، اِس لیے ہندُستان کی صورت کا عکس اُس کے دِل و دماغ میں پایا جاتا ہے ۔



یہ ایک قُدرتی چیز ہے کہ ہندُستان کے قُدرتی اختلاف بھی ہندُستان کے باشندوں میں پائے جائیں۔ چنانچہ ہندُستان کا باشندہ ہٹلر کے نارڈک نسل کی طرح گورا بھی ہوتا ہے اور افریقہ کے حبشی کی طرح کالا بھی۔ وہ لمبا تڑنگا بھی ہوتا ہے اور موری بونوں کی طرح ٹھنگنا بھی۔ وہ موٹا تازہ اور طاقتور بھی ہوتا ہے اور دُبلا پتلا اور کمزور بھی۔



وہ اِس تصویر کی طرح بھی ہوتا ہے اور اِس تصویر کی طرح بھی اور ۱۹۴۲ء میں بھی اِس مُلک میں کوئی نہ کوئی ایسا ضرور مل جائے گا جو اپنے مذہبی عقیدوں اور اپنے رہنے سہنے کے طریقوں کے اعتبار سے پانچویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے زمانے تک کے کسی



نہ کسی دور سے تعلّق رکھے گا۔ شاید سوویٹ رُوس کے سوا دُنیا کے کسی حصّے میں بھی بنی نوعِ انسان کے اتنے نمونے نہیں پائے جاتے جتنے کہ ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔

چار سو ملین یعنی چالیس ۴۰ کروڑ کی زبردست آبادی نے ہندوستان کو کتنی زبردست اِنسانی قوّت بخشی ہے۔ جو چین کے بعد دُنیا میں سب سے زیادہ ہے۔

اِس واقعے سے کہ ہماری تعداد بہت زیادہ ہے اور ہم میں کئی قسم کے اختلاف بھی پائے جاتے ہیں مل جُل کر رہنے میں دِقتیں اور مُختلف قسم کے جھگڑے بھی پیدا ہو سکتے ہیں اور پیدا ہو رہے ہیں جن کا تصفیہ کرنا ضروری ہے۔ تاہم ذرا سوچو تو سہی کہ یہ قوّت کتنی زبردست ہے اور اِس سے کتنے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں!

انسان نے اپنے لیے غذا، لباس، مکان اور دُوسری چیزوں کے حاصل کرنے میں جو ترقّی کی ہے اُس کا سبب بڑھتی ہوئی تقسیمِ کار (division of labour) ہے۔ تمھارے بزرگ جو کچھ



انسانی قوت
چالیس کروڑ

کھاتے ہیں وہ خود نہیں بوتے اور جو چیزیں استعمال کرتے ہیں وہ خود اپنے ہاتھ سے نہیں بناتے۔ کیوں؟ ہے نا یہی بات۔ وہ بڑی ہوشیاری کرتے ہیں۔ یعنی وہ کسانوں کے تجربوں اور اُن لوگوں کی مہارت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں جو اُن کے پہننے کے لیے کپڑے اور جُوتے بناتے ہیں، بال مونڈنے کے لیے اُسترے تیار کرتے ہیں اور



پڑھنے کے لیے کتابیں لکھتے ہیں۔ اگر وہ خود اپنے ہاتھ سے یہ سب کام کرنا چاہیں تو باوجود اپنی ہوشیاری کے (اور بزرگ تو بزرگ ہی ہوتے ہیں، ہمیشہ ہوشیار اور عقلمند!) وہ کچھ بھی نہ کرسکیں گے۔ ہمیں روزمرہ کے استعمال کے لیے بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اِن تمام چیزوں کو یا کم سے کم اُن کے بیسویں حصّے کو بھی محنتی

سے محنتی اور ہوشیار سے ہوشیار آدمی بھی نہ تو بنانا سیکھ سکتا ہے اور نہ اُسے سیکھنے کا وقت مل سکتا ہے۔ اس لیے سیکڑوں سالوں کے تجربوں سے سبق لے کر ہم نے آپس میں کام تقسیم کر دیا ہے۔ کچھ لوگ کھانے کے لیے کھیتوں میں گیہوں، چاول ترکاریاں، اور پھل پھلاری بوتے ہیں، کچھ لوگ کارخانوں میں کپڑے بُنتے ہیں، کچھ جوتے تیار کرتے ہیں، کچھ موٹریں اور ریڈیو بناتے ہیں اور کچھ لوگ میز کرسی پر بیٹھے کتابیں لکھتے ہیں۔ تقسیم کار کے اصول کو آج کل اتنی ترقی ہوگئی ہے کہ ایک معمولی چیز؛ مثلاً کپڑے کا ٹکڑا بھی ممکن ہے کہ ایسے بیسیوں آدمیوں کا کام ہو جنھوں نے اُس میں سے کسی ایک کام کو خاص طور سے سیکھا ہے؛ جیسے رُوئی یا نا رُوئی سے بنولے الگ کرنا، اسے صاف کرکے گالے تیار کرنا، پھر روئی کات کر تاگا نکالنا اور تاگے سے کپڑا بُننا اور پھر اُس کپڑے سے کوئی پہننے کی چیز تیار کرنا۔

جس طرح مُختلف لوگ مختلف کاموں کے ماہر ہوتے ہیں اُسی طرح مُختلف نسلوں اور مُختلف خاندانوں کے لوگوں میں مُختلف خُوبیوں کا دل و دماغ ہوتا ہے جس کی بدولت وہ کسی خاص کام کرنے کے موزوں یا ناموزوں ہوتے ہیں۔

اسی طرح مُختلف قسم کی زمینوں میں مُختلف قسم کے غلّے پیدا ہوتے ہیں اور مُختلف قسم کی آب و ہوا یعنی گرمی یا سردی، تری یا خُشکی خاص قسم کی پیداوار یا صنعت کے لیے موزوں یا ناموزوں ہوتی ہے۔

ذرا غور کرو کہ ہندُستان کتنا خوش نصیب ہے اور اُسے کتنا دولت مند ہونا چاہیے، جس میں ہر رنگ کا آدمی، ہر قسم کی زمین اور ہر قسم کی آب و ہوا موجُود ہے!

اِس کے یہ معنی ہیں کہ ہندُستان وُہ مُلک ہے جس میں کہیں نہ کہیں وہ تمام خام پیداواریں پائی جاتی ہیں جن سے باشندوں کی ضروریات کی سب چیزیں بنائی جا سکتی ہیں۔ اِس کے یہ معنی ہیں کہ ہم ہندُستانی، ہندُستان ہی میں وہ تمام چیزیں اُگا سکتے ہیں یا بنا سکتے ہیں جن کی ہمیں ضرورت ہے! مثلاً کیا تم انگلستان میں روئی اور عرب کے ریگستان میں سیب پیدا کرنے کا خیال کر سکتے ہو؟ ہرگز نہیں۔ مگر ہندُستان میں روئی بھی پیدا کی جا سکتی ہے اور سیب بھی۔ یہاں ہر چیز سودیشی ہے ؞

دُوسرا باب

کیا تم دھُوپ کھا سکتے ہو؟

انگریزی کے مشہور شاعر ملٹن نے اپنی سب سے زبردست نظم "کھوئی ہوئی جنت" (Paradise Lost) میں "ہُرمز اور ہند کی دولت کا ذکر کیا ہے"۔ واقعی، پہلے زمانے میں ہندُستان کی دولت ضرب المثل تھی۔

یہ ہندُستان کے لعل و جواہر، چاندی سونے اور مُشک و کافور وغیرہ ہی کی شُہرت تھی جس کو سُن کر دُور دُور کے مُلکوں کے باشندوں کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ بہر حال اگر تم مجھ سے پوچھو کہ ہندُستان کی سب سے زیادہ قیمتی دولت کیا ہے تو نہ تو میں کسی بڑی سے بڑی ریاست کے سونے چاندی اور لعل و جواہر سے بھرے ہوئے خزانوں کی طرف اشارہ کروں گا، نہ میں اپنے لکھ پتی تاجروں اور کروڑ پتی مہاجنوں کی دولت کا ذکر کروں گا اور نہ میں رئیسوں کے شاہی محلوں اور امیروں کی ڈیوڑھیوں کی سیر کراؤں گا؛ بلکہ میں اُس عظیم الشان مُلک کی زمین، اُس کے دریا، اُس کی بارش، اُس کے سُورج، اُس کے پہاڑ اور سب سے زیادہ اُس کے اُن کروڑوں

مردوں، عورتوں اور بچّوں کی طرف اشارہ کروں گا جو اُس میں رہتے سہتے ہیں ؛

بیسویں صدی کے نوجوانو! تُم شاید میرا مذاق اُڑاؤگے اور کہوگے " نہ تو ہم سورج کو کھا سکتے ہیں، نہ دریاؤں کو پی سکتے ہیں اور نہ پہاڑوں پر رہ سکتے ہیں!" کیوں؟ کیا تُم واقعی یہ سب نہیں کرسکتے؟ میرا خود اِس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ تم سچ مچ ایسا کرسکتے ہو۔ اگرچہ بعض سادھُو اور دُنیا سے الگ رہنے والے لوگ ایسا بھی کرتے ہیں!۔لیکن ذرا غور سے دیکھو، کیا اُن چیزوں کو جنھیں ہم کھاتے اور پیتے ہیں یا جنھیں پہنتے اور اوڑھتے ہیں یا جن سے ہم اپنے رہنے سہنے کے مکان بناتے ہیں، ہم اُن ہی نعمتوں سے حاصل نہیں کرتے؟

مثال کے طور پر ترکاریوں کو لو جو ہم عام طور پر کھاتے ہیں۔ وہ کیا ہیں؟ وہ سچ پوچھو تو سوُرج، مٹّی، پانی اور ہوا ہیں۔ اِس لیے کہ ترکاریوں میں سب سے بڑا جُزو پانی ہے۔ وہ ہوا سے گیس حاصل کرتی ہیں، جسے کاربن ڈائی آکسائڈ (carbon dioxide) کہتے ہیں اور مٹّی سے نمک یا کھار حاصل کرتی ہیں جسے ہم نائٹریٹس (nitrates) کہتے ہیں۔ تمام ترکاریوں میں یہی سب سے زیادہ اہم اجزا ہیں۔ اِن اجزا کو جو قوّت غذا میں تبدیل کرتی ہے وہ سوُرج کی گرمی اور روشنی ہے۔ مثلاً: کیا تم یہ نہیں جانتے کہ کرم کلّے (cabbage) میں ۹۶۵ فی صدی پانی ہوتا ہے؟ یہ چند مثالیں ہیں جو حقیقت کی طرف تمھاری رہنمائی کریں گی


سورج
نائٹریٹس
پانی

اور جن سے اصل حقیقت کے سمجھنے میں تمھیں مدد ملے گی۔ اگر تمھارا اُستاد یہ کہے کہ مُلک کی دولت کا انحصار اُس کے بینکوں پر ہے تو تُم ہرگز یقین نہ کرنا بلکہ دِل ہی دِل میں سمجھ لینا کہ تم اِس واقعے کو زیادہ بہتر جانتے ہو۔ یہ یاد رکھو کہ ہندُستان میں دھوپ اور پانی اِس قدر کافی ہے کہ تقریباً "تمام اضلاع" میں سالانہ دو دو فصلیں اور "بعض میں" تین تین فصلیں اُٹھائی جا سکتی ہیں۔ اور اُس بات پر تم اپنے دِل ہی دِل میں ہنسو!

آؤ، اب ہم اپنے مُلک کی دولت کی ایک فہرست بنائیں۔ مگر یاد رہے کہ یہ فہرست کسی طرح بھی مکمّل نہیں کہی جا سکتی۔ بڑے بڑے قابل پروفیسروں نے اِس قسم کی فہرست تیار کرنے کی کوشش کی ہے اور اِس کے متعلّق بڑی بڑی موٹی کتابیں لِکھ ڈالی ہیں مگر سچ پُوچھو تو وہ سب کی سب ابھی تک ادھوری ہیں۔ ہم اِس وقت چند چیزیں گنواتے ہیں جن سے ہماری امیری اور دولت کا اندازہ ہوگا۔ اور اِس سے وہ لوگ سبق حاصل کریں گے جو اپنی کم علمی کی وجہ سے خواہ مخواہ رنجیدہ اور پریشان رہتے ہیں ؛

ہمیں اپنی قیمتی چیزوں کی فہرست میں سب سے پہلے کِس چیز کو لِکھنا چاہیے؟ ہمیں اِس بارے میں انکساری نہیں کرنی چاہیے اور سب سے پہلے "خُود" کو لکھنا چاہیے۔ رَسکِن! ایک زبردست فلسفی، نوعِ انسان کا خادم اور ایک مشہور و معروف انگریز گزرا ہے۔ اُس کی چھوٹی سی کتاب "سیسم اور لِلیز" (Sesame and

(Lilies شاید تُم اِسکول یا کالج میں پڑھوگے۔ اُس کتاب میں اُس نے یہ بار بار دُہرایا ہے کہ خُوش حال اور تندرست لوگ مُلک کی سب سے بڑی دولت ہیں۔ اور یہ واقعی اُس نے بڑے پتے کی بات کہی ہے ؛

ذرا سوچو تو کہ ہندُستان کی صنعت و حرفت کو ترقّی دینے میں یہاں کی چالیس کروڑ کی زبردست آبادی کِس بلا کی "اِنسانی قُوّت" (man-power) ہے ؛

ہندُستان کے لوگوں کے مُتعلّق بلا مُبالغہ یہ دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ وُہ سمجھ اور عقل میں کسی طرح دُوسرے لوگوں سے کم نہیں ہیں۔ وہ ایک شاندار تمدّن اور پُرانی تہذیب کے مالک ہیں۔ ہاں، یہ بات ضرور ہے کہ گرمی سے سُستی پیدا ہوتی ہے اور کام کرنے کی قُوّت میں فرق آ جاتا ہے۔ لیکن کئی موقعوں پر جب ہندُستانیوں کو دُوسری نسل کے لوگوں کے ساتھ ساتھ کام کرنے کا موقع مِلا تو اُنھوں نے اپنے کام نہایت خُوبی اور خُوش اسلوبی سے انجام دِیے۔ مثلاً: ریاست ہائے مُتّحدۂ امریکہ میں کیلوفورنیا کے کھیتوں اور باغیچوں کا واقعہ لے لیجیے یا کینیڈا میں برطانوی کولمبیا، واشنگٹن اور اوریگن کے چوبی کارخانوں کی مثالیں لے لیجیے؛ وہاں اُنھوں نے بالکل امریکیوں، کینیڈیوں، میکسیکیوں، چینیوں اور جاپانیوں کی طرح کارگُزاری دِکھائی ہے اور کسی طرح کسی کام میں اُن سے پیچھے نہیں رہے۔ مگر جیسا کہ ہم ابھی بتا چُکے ہیں، قابلیت کے ساتھ ساتھ اُن میں بے شمار اقسام بھی موجُود ہیں ؛

اب ہماری فہرست میں دُوسرا نمبر" جانوروں" کا ہے. جو ہماری طرح زندہ مخلوق ہیں۔ ہمارے یہاں سب قسم کے جاندار؛ یعنی ہاتھی سے لے کر سانپ اور مچھر تک موجُود ہیں۔ ان سب میں مویشی[1] (مواشی) سب سے زیادہ کارآمد ہیں۔ یہاں اِن کی تعداد ۱۸ کروڑ کے قریب ہے۔ اگر دُنیا بھر کے مویشیوں کی تعداد سے اِس تعداد کا مقابلہ کیا جائے تو یہ تعداد ایک تہائی .ہوتی ہے۔ اِن کے علاوہ .بھیڑ اور بکریوں کی تعداد آٹھ کروڑ ستر لاکھ کے قریب ہے جو دُنیا بھر کی بھیڑوں اور بکریوں کی تعداد کا ساتواں حِصّہ ہے ۔

تیسرا درجہ "سُورج" کا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں" سُورج تو ہر جگہ ہوتا ہے"۔ کیا یہ سچ ہے؟ اچھا بتاؤ اُن کو کس قدر اور کتنی دیر کے لیے سُورج دِکھائی دیتا ہے؟ سُورج ہمارے وِرثے میں بڑی قیمتی چیز ہے۔ مجُھے معلوم ہے کہ ہم میں سے بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سُورج کی وجہ سے یہاں گرمی زیادہ پڑتی ہے۔ اِس سبب سے ہمیں پیاس بہت معلوم ہوتی ہے۔ مگر ذرا دُوسری طرف تو آنکھ اُٹھا کر دیکھو کہ وُہ ہمیں کیا کیا فائدے پہنچاتا ہے۔ اُس کی طاقتور کِرنیں ہمارے لیے وقف ہیں؛ وُہ ہمارے جسم میں داخل ہوکر توانائی اور زِندگی پیدا کرتی رہتی ہیں، وہ مٹی میں پہنچ کر ہماری زمین کو زرخیز بناتی ہیں، بحرِ ہند کے پانی کو اُڑا کر بادل بناتی ہیں "تاکہ مان سُون اُسے ہمالیہ کے پہاڑوں پر لے جائے۔ اور ہمارے مُلک میں مینہ برسائے۔ وُہ ہمارے نالابوں اور

---

[1] صحیح لفظ مواشی ہے مگر عام طور سے مویشی رائج ہے ۔ مترجم

دلدلی مقاموں کے بند پانی کو خشک کرتی ہیں اور ہزاروں زہریلے جراثیم اور کیڑوں کو تباہ کرتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ گرم خطّوں کے لوگ خواہ وُہ ہندو ہوں یا ایرانی، سُورج کو پوُجتے تھے اور سُوریا[1] نمسکار کے لیے سر جھکائے کھڑے رہتے تھے ۔

"مان سُون" ہماری چوتھی بڑی ملکیت ہے۔ ہمارے کسان، اپنی زمینوں کی سیرابی کے لیے کس بے قراری سے اُس کا اِنتظار کرتے رہتے ہیں۔ اِس کے عِلاوہ یہ سمندر کے پانی کو پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچاتا ہے جس کی وجہ سے دریا سال کے بارہ مہینے بہتے رہتے ہیں ۔

اِس کے بعد "ہمالیہ کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں" اور "بڑے بڑے پہاڑوں" کا نمبر ہے جو دیووں کی طرح اپنے قدم جمائے کھڑے ہیں۔ یہ سب پہاڑیاں اور پہاڑ باہر کے لوگوں کو ہم پر حملہ کرنے سے روکتے ہیں اور ہمارے مُلک کو وسطی ایشیا کی خشک ہوا سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو وہ ہوائیں ہماری زراعت کو خُشک کر دیتیں اور شمالی ہندُستان کو ریگستان بنا دیتیں۔ اِس کے عِلاوہ پہاڑ قُدرتی پانی کے خزانے ہیں جن کی بدولت میدانوں میں بہتے ہوئے دریا اور گرتے ہوئے آبشار دِکھائی دیتے ہیں۔ یہ مریضوں اور کمزور لوگوں کے لیے صحت گاہیں اور میدانوں میں رہنے سہنے والوں کے لیے تفریح گاہیں ہیں ۔

پھر "دریاؤں" کی باری آتی ہے۔ یہ ہماری زمین کو سیراب کرتے

---

[1] سُوریا یعنی سُورج اور نمسکار یعنی بندگی یا ڈنڈوت ۔

ہیں - اِس لیے کہ ہماری اور تُمھاری طرح زمین بھی سُورج کی گرمی سے تپتی ہے اور پیاسی ہو جاتی ہے - اِس کے علاوہ بہتا ہُوا پانی قُوّت کا ایک بہت بڑا سرچشمہ ہے جسے ہم تار میں بند کر لیتے ہیں۔ اِس قُوّت کو برق یا بجلی کہتے ہیں جس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے - ہمارے آبی قُوّت (water-power) کے یہ سرچشمے کینیڈا اور ریاست ہائے مُتحدۂ امریکہ کے مُقابلے میں بھی بڑے ہیں ؁

اب "ہوا" کے متعلّق کیا کہتے ہو؟ ہوا کے متعلّق، ہاں، ایک تو یہ ہمیں تروتازہ اور ٹھنڈا رکھتی ہے اور دوسرے اگر ہم تمام ہندستان میں ہوا پنکھے (windmills) لگا دیں اور اُس سے قُوّت حاصل کریں تو ایک مصنّف کے قول کے مطابق ہم برق کی شکل میں اِس قدر قُوّت حاصل کر سکتے ہیں جو تمام دُنیا کی ضرورتوں کے لیے کافی ہوگی!

اب ہوا کو چھوڑ کر "زمین" کو لو - ہماری زمین کی پُوری سطح زراعت کے کام میں نہیں لائی جا سکتی - اِس کے بعض حصّوں پر شہر آباد ہیں، بعض پر قصبے اور گانو آباد ہیں، بعض بنجر ہیں یا یہ کہو کہ وہ زراعت کے لیے ناموزون یا ناقابلِ کاشت ہیں - اِس پر بھی یہ تخمینہ کیا گیا ہے کہ ہماری زمین کا تقریباً ایک چوتھائی حصّہ ایسا ہے جس میں کچھ نہ کچھ پیدا ہو سکتا ہے ؁

تقریباً دس کروڑ ایکڑ سے زیادہ رقبے پر قُدرت نے ہمارا کام خود اپنے ہاتھ سے انجام دے دیا ہے؛ یعنی اِس رقبے کو بڑے بڑے اور موٹے موٹے درختوں سے بھر دیا ہے اور اِس طرح ایک سرسبز اور شاداب جنگل تیّار کر کے ہمارے حوالے کر دیا ہے - اِس جنگل کا

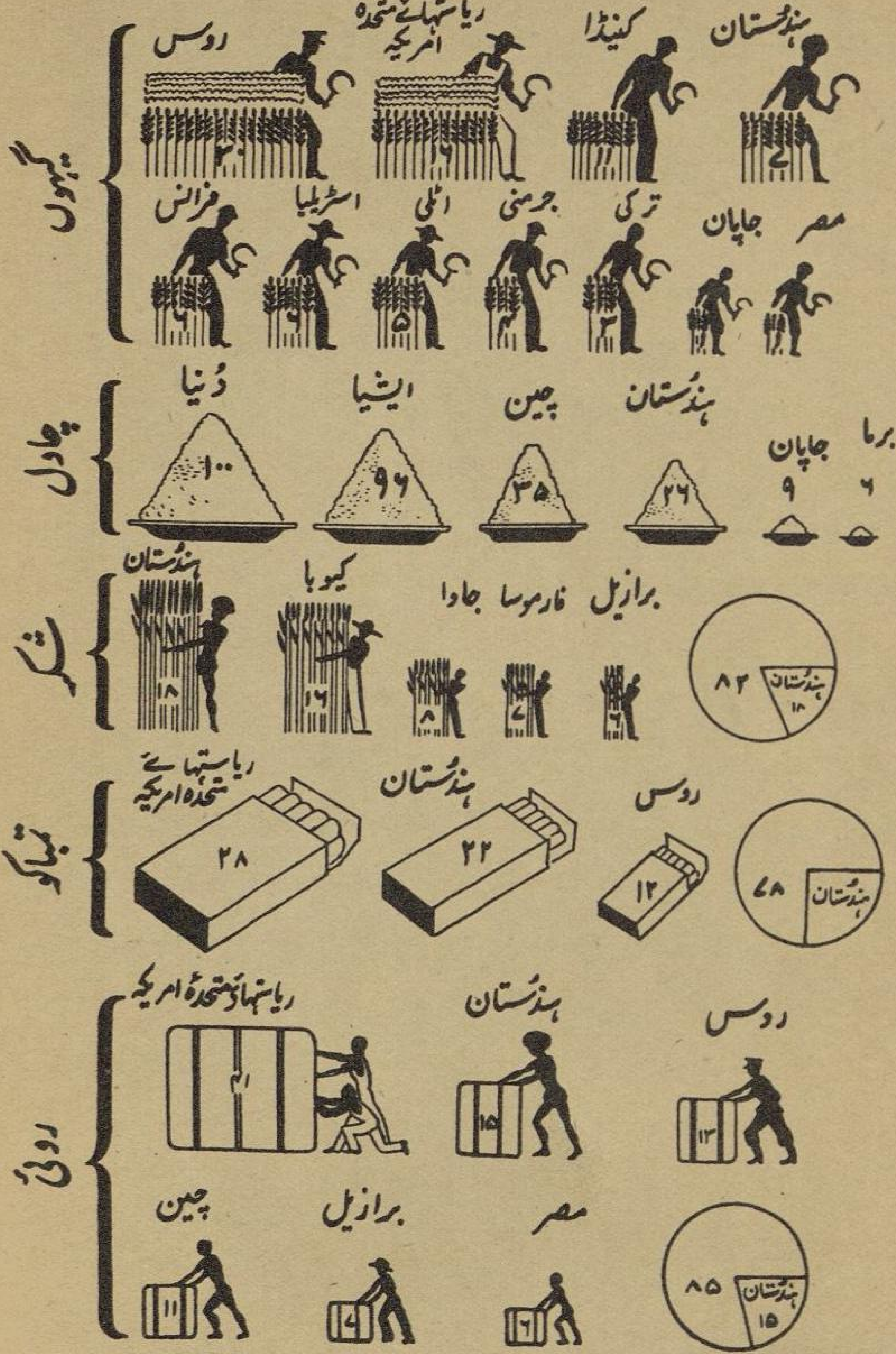
رقبہ قریب قریب ہماری قابلِ کاشت زمین کے پانچویں حصّے کے برابر ہے۔ ایک انگریز انجینیر نے تخمینہ کیا ہے کہ ہمارے جنگل دس کروڑ ٹن[1] لکڑی سالانہ مہیّا کر سکتے ہیں اور اِس پر بھی اُن میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی!

باقی حصّوں میں ہم جہاں جو چیز چاہیں اپنی ضرورتوں کے مطابق "بو سکتے ہیں"۔ میں نے یہ کہا ہے نا کہ "بو سکتے ہیں"۔ اِس کی یہ وجہ ہے کہ ابھی ہم کچھ بھی "نہیں بو رہے ہیں"۔ آیندہ چل کر ہم بتائیں گے کہ ہم زمین کو کس قدر زیادہ کام میں لا سکتے ہیں اور اِس حالت میں بھی جو فائدے ہم اِس سے حاصل کرتے ہیں وہ کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اب ہم صرف اُن چیزوں کا ذکر کرتے ہیں جن سے وہ بھرپُور ہے۔

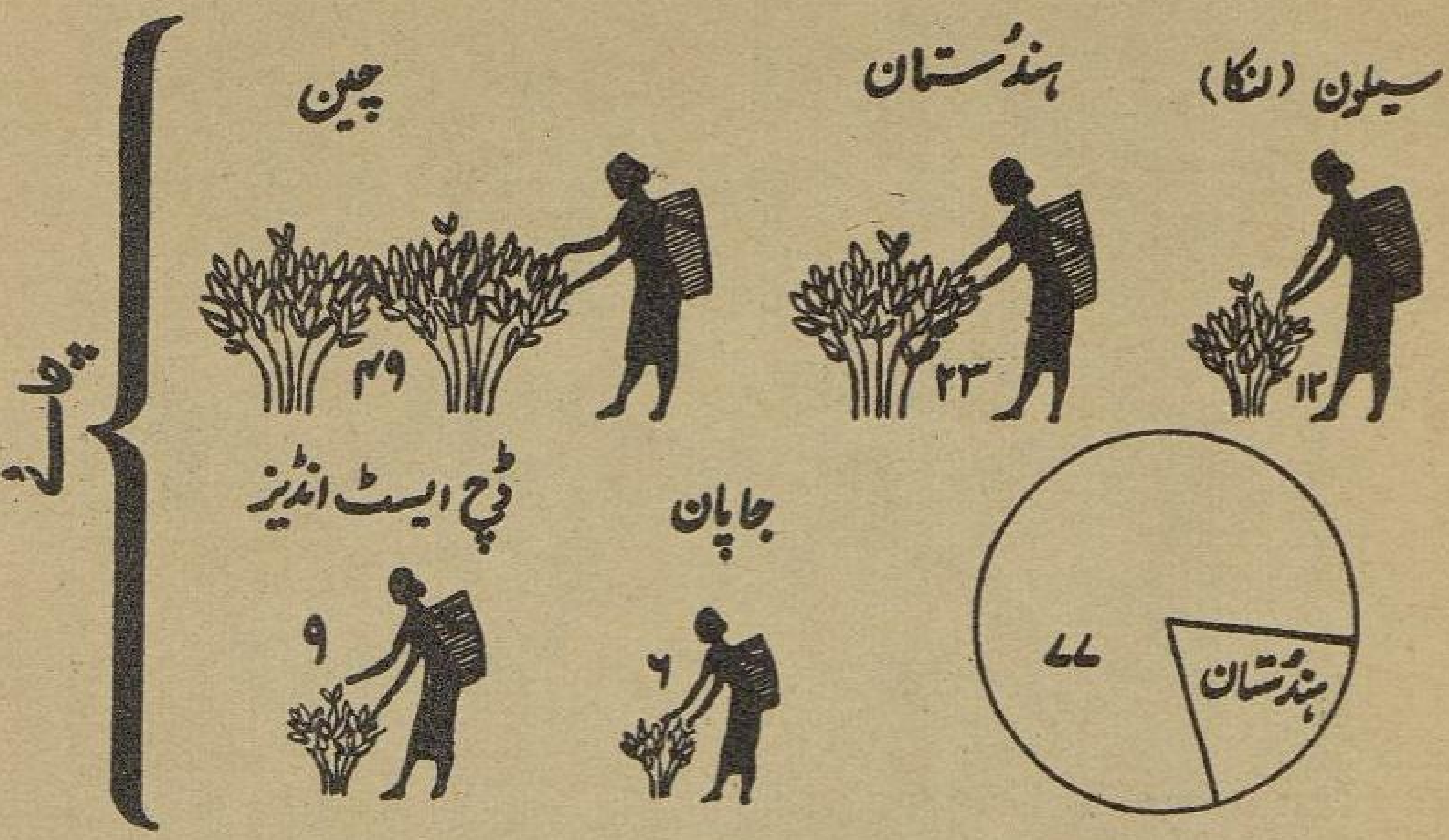
اِن تصویروں سے تُمھیں اچھّی طرح معلوم ہو جائے گا کہ ہماری ضرورتوں کی چیزیں ہندُستان میں کتنی مقدار میں پیدا ہوتی ہیں۔ تم دیکھو گے کہ گیہوں، چاول اور شکّر جو ہم کھاتے ہیں، چائے جو ہم استعمال کرتے ہیں، تمباکو جسے بعض بڑی عُمر کے لوگ پیتے ہیں اور رُوئی جس سے ہم اپنی پوشاک تیار کرتے ہیں، ہندُستان میں کثرت سے پیدا ہوتی ہے۔

---

[1] ایک ٹن تقریباً ۲۸ من کے برابر ہوتا ہے۔



گیہوں
روس
ریاستہائے متحدہ امریکہ
کینیڈا
ہندستان
فرانس
اسٹریلیا
اٹلی
جرمنی
ترکی
جاپان
مصر
چاول
دنیا
ایشیا
چین
ہندستان
برما
جاپان
۱۰۰
۹۶
۳۵
۲۶
۹
۶
شکر
ہندستان
کیوبا
برازیل
فارموسا
جاوا
۱۸
۱۶
۸
۷
۶
۸۲
تمباکو
ریاستہائے متحدہ امریکہ
ہندستان
روس
۲۸
۲۲
۱۲
۷۸
روئی
ریاستہائے متحدہ امریکہ
ہندستان
روس
چین
برازیل
مصر
۱۵
۱۳
۱۱
۴
۸۵



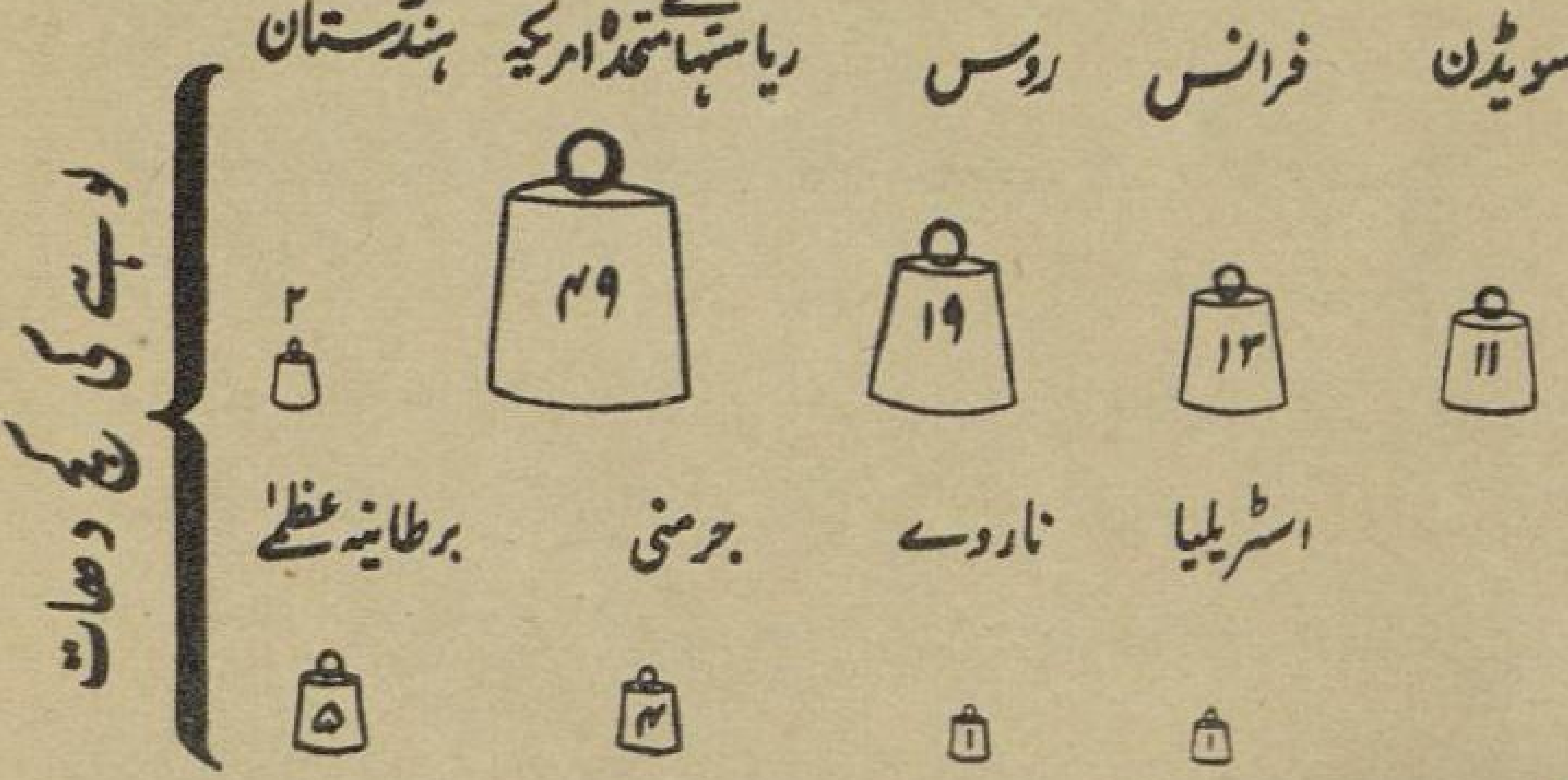
اگر تمام دُنیا کی پیداوار کو سَو خیال کرو تو ہر تصویر کے عدد سے ہر مُلک کی پیداوار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

یہاں تک تو ہم دُھوپ کھاتے رہے ، بادلوں پر تیرتے رہے ، ہوا پر اُڑتے رہے اور سخت مٹّی کے اُوپر چلتے پھرتے رہے ۔ چلو ، اب زمین کھودیں اور اپنے چھُپے ہوئے خزانوں کو ڈھونڈیں ۔ ہماری معدنیات کا ذخیرہ اب تک پوری طرح دریافت نہیں ہُوا ہے اور ایسے کا ایسا ہی پڑا ہُوا ہے ۔ بہر حال ہمیں اِس بات کا علم ہے کہ ہمارے پاس "کوئلوں" کا بہت بڑا ذخیرہ ہے ۔ اگرچہ وہ بعض ممالک مثلاً : برطانیۂ عظمےٰ ، ریاست ہائے متحدۂ امریکہ اور سوویٹ رُوس کے مقابلے میں بہت کم ہے ۔ وہاں یہ دولت بہت زیادہ ہے ۔ ہمارے ہاں صرف ۲۸ ملین میٹرک ٹن سالانہ کوئلہ نکالا جاتا ہے ۔ اگرچہ وہ ہماری زمین میں ۵۳،۰۰۰ ملین ٹن کے قریب موجود ہے ۔ دوسرے صفحے

پر جو تصویر ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دُوسرے مُلکوں میں کوئلے کی پیداوار کا کیا اندازہ کیا گیا ہے



ہم لوہے کی کچ دھات (iron ore) کے مُعاملے میں بھی خاصے اچھے ہیں۔ اِس لیے کہ بعض تجربے کار اور قابل لوگوں کا خیال ہے کہ برطانیہ عظمیٰ اور فرانس کے بعد ہمارے یہاں سب سے زیادہ لوہے کا ذخیرہ موجود ہے۔ پھر لُطف یہ ہے کہ مقدار ہی میں نہیں بلکہ اوصاف میں بھی دُنیا نے اُس کا لوہا مان لیا ہے۔ لیکن تم اِس تصویر میں دیکھوگے کہ ہم اپنے ہاں کا لوہا بہت کم مقدار میں



استعمال کر رہے ہیں۔

سوویٹ روس کے سوا ہندستان میں سب سے زیادہ مینگنیز کی کچ دھات (manganese ore) موجود ہے۔ اس لیے کہ روس سے ۱۹۳۶ء میں تیرہ لاکھ چھتّیس ہزار میٹرک ٹن مینگنیز کی کچ دھات نکالی گئی تھی اور ہندستان سے چار لاکھ چودہ ہزار میٹرک ٹن نکالی گئی تھی جو دنیا بھر کی پیداوار کا چھٹا حصّہ ہے۔



میں اپنے ہاں کے قدرتی دولت کے اتنے خزانے گنواتا چلا جاؤں گا کہ سنتے سنتے تمھارا دماغ چکرا جائے گا۔ مگر اب میں اپنے اس بیان کو ختم کرتا ہوں۔ البتہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم یہ محسوس کرو کہ ہندستان جیسے عظیم الشان ملک پر ہمیں اور تمھیں دونوں کو فخر کرنا چاہیے۔ اب رہا یہ کہ ہندستان بھی ہم پر فخر کر سکتا ہے یا نہیں تو یہ ایک ٹیڑھا سوال ہے۔ اس کا جواب ہم کسی دوسرے

موقع پر دیں گے۔ ہاں، اب اگر تُم سمجھدار اور کھوجی ہو تو شاید یہ سُوال ضرور کر بیٹھو گے کہ "ہمیں اِس عظیم الشّان مُلک سے کیا فائدہ اُٹھانا چاہیے"؟ یا اِس کے وسیع ذریعوں کو کہاں کہاں استعمال کرنا چاہیے؟" خیر، میں تُمھارے اِس سُوال کا بھی جواب دینے کی ضرور کوشش کروں گا مگر اِس وقت نہیں آگے چل کر کسی دُوسرے باب میں ؂

مُفلس ہندُستان

اے غُلام آباد، اے حسرت نشاں ہندُستاں / مُفلس و ناچار قلاّشِ زماں ہندوستاں
جس طرف دیکھو نظر آتی ہے اک افسردگی / ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتا مسرت کا نشاں
جس کو دیکھو وہ نظر آتا ہے گھبرایا ہُوا / جس کو دیکھو کر رہا ہے نالہ و آہ و فغاں
جس کو دیکھو شکل پر چھائی ہوئی ہے مُردنی / رنج و غم سے سرنگوں فاقہ کشی سے نیم جاں
پانْو میں جوتا نہیں، کپڑا نہیں ہے جسم پر / مُفلسی نے جامۂ ہستی کی کر دِیں دھجیاں
تنگ اور بوسیدہ حُجروں میں پڑے رہتے ہیں وہ / تیرہ و تاریک ہیں اُن تیرہ بختوں کے مکاں
رینگتے رہتے ہیں بچے اُن کے کیڑوں کی طرح / ہوتے ہیں کمزور و لاغر اور ضعیف و ناتواں
سیکڑوں بچپن ہی میں ہو جاتے ہیں نذرِ اجل / اور چلنے بھی نہیں پاتے زمیں پر گھُٹنیاں
بچ گیا قسمت ہی سے جو کم سِنی کی موت سے / دیکھنا پڑتا ہے پھر اُس کو قیامت کا سماں
اُنکی اوسط زندگی لے دے کے ہے بس تیس سال / اِتنی چھوٹی زندگی اور یہ مُصیبت الاماں

ہیں بہت کم وہ جنھیں ہے فارغ البالی نصیب
ہیں بہت کم وہ کہ جو ہیں صاحبِ دولت یہاں

(عصمت)

تیسرا باب

گورکھ دھندا

میرے ایک دوست بمبئ کے کسی دفتر میں نوکر ہیں۔ وہ پانسو روپے ماہوار کماتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اِس زمانے میں ایک ہندُستانی کو یہ آمدنی "بہت کافی" ہے۔ مگر میرے خیال میں جو شخص کہ مہذّب لوگوں کی زندگی بسر کرنی چاہے اُسے اپنی زندگی کے معیار کو قائم رکھنے کے لیے یہ رقم "کچھ زیادہ نہیں" ہے ۔

بہر حال میرے یہ دوست اپنی بیوی اور بچّوں کے ساتھ ایک نہایت عمدہ اور آراستہ مکان میں رہتے ہیں جو شہر کے ایک نہایت صاف سُتھرے اور کھُلے ہوئے حصّے میں ہے۔ اُن کے بچّے ایک ایسے مدرسے میں شریک ہیں جہاں مخلوط تعلیم (co-education) ہوتی ہے۔ اُن کی بیوی اور وُہ ایک گشتی کتاب خانے کے ممبر بھی ہیں جہاں سے نئی نئی کتابیں اُنھیں مِل جاتی ہیں۔ اِس کے عِلاوہ ، وہ ایک کلب میں بھی شریک ہیں جہاں شام کے وقت جاکر ٹینس وغیرہ کھیلتے ہیں۔ اُن کے پاس سواری کے لیے موٹر ہے جسے وُہ خود چلاتے ہیں۔ سال میں ایک بار جب چھُٹّی ملتی ہے۔ تو وہ اپنے بال بچّوں کے ساتھ اِس عظیم الشّان مُلک میں سیر کرنے کے لیے کہیں

باہر چلے جاتے ہیں ۔

ہندُستان میں ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں جو اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں ۔ مجھے اُمید ہے کہ اِس کتاب کے پڑھنے والوں میں شاید ہی ایسے خوش قسمت لوگ ہوں گے ! سوچنے کی بات ہے کہ جو لوگ شہر اور گنجان آبادی میں رہتے ہیں وہ "سب کے سب" اسی طرح کی زندگی کیوں نہیں بسر کرتے ۔ کیا وُہ میرے دوست کی طرح رہتے سہتے ہیں ؟

تُم کہو گے "ہرگز نہیں ، اُن میں تو زیادہ تر غریب ہیں ۔" بالکل ٹھیک ہے ۔ ہمارے شہر میں کثرت سے غریب بستے ہیں ۔ بالکل غریب ، مُفلس اور قلاّش ۔ وہ لوگ رنج و غم کے بوجھ سے دبے ہوئے ، بدبُودار ، اندھیری اور غلیظ کوٹھریوں میں ٹھُسے پڑے رہتے ہیں ۔ چار چار ، پانچ پانچ اور بعض جگہ دس دس آدمی ایک تنگ و تاریک حُجرے میں پڑے ہوئے اپنی زندگی کے دِن کاٹتے ہیں ۔ اُن کے حجروں کے فرش گرد و غبار سے اٹے رہتے ہیں اور دیوار و در دھوئیں کی سیاہی سے پٹے رہتے ہیں ۔ نہ تو اُنھیں پیٹ بھر روٹی میسّر ہے اور نہ پہننے کو کپڑا ۔ اب رہے اُن کے بچے تو وُہ بیچارے تعلیم و تربیّت تو رہی ایک طرف ، الف کے نام بے بھی نہیں جانتے ۔ اگر کسی خدا کے بندے نے ہمّت کر کے اپنے بچّے کو مدرسے میں شریک بھی کرایا اور وُہ لکھنا پڑھنا اور حساب کتاب سیکھ بھی گیا تو اِدھر مدرسہ چھوٹا اور اُدھر لکھائی پڑھائی رُخصت ۔ ہمارے عوام کی زندگی بڑی دردناک ہے !

ہم شہر میں رہنے والے اپنے ہاں کے کارخانوں اور گرنیوں کے مزدوروں کو بہت زیادہ غریب سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ ماہانہ پندرہ ۱۵ یا بیس ۲۰ روپے سے لے کر پچاس ۵۰ روپے تک کماتے ہیں اور اِس تھوڑی سی آمدنی میں اپنے پورے خاندان کو پالتے ہیں۔ ذرا سوچو تو سہی کہ یہ کس قدر دِل ہلا دینے والی بات ہے۔ کہو کیا کہتے ہو، ہے کہ نہیں؟ ہیں تو کہتا ہوں "تم اکیلے" بھی اِتنی سی آمدنی میں بسر نہیں کر سکتے! مگر سچ پوچھو تو اِن مزدوروں کی جو اُجرت ہے وہ ہمارے اُن کروڑہا دیہاتیوں کی آمدنی کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے جو گانو میں رہتے ہیں اور کھیتی باڑی کے کاموں میں رات دِن جُٹے رہتے ہیں؛ یہ اپنا خون پانی ایک کر کے غلّہ اُگاتے ہیں جسے ہم کھاتے ہیں اور روئی پیدا کرتے ہیں جس سے ہم پہننے کے کپڑے بناتے ہیں۔

یہ بات تو ایک ضرب المثل ہو گئی ہے کہ اکثر ہندُستانیوں کو ایک وقت بھی پیٹ بھر کھانا نہیں مِلتا۔ پھر ایسا کھانا جیسا کہ انگلستان، امریکہ یا آسٹریلیا کے باشندوں کو مِلتا ہے۔ مگر جوں جوں ہماری عمر بڑھتی ہے اِن تکلیف دہ واقعات کا احساس بھی ہمارے دل سے مِٹتا جاتا ہے۔

تاہم یہ مبالغہ نہیں بلکہ ایک دردناک واقعہ ہے۔ ہمارے کالجوں کے پروفیسر بڑی تحقیق کے بعد اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمارے مُلک کا ایک معمولی کسان اپنی ایک بیوی اور تین بچّوں کے ساتھ صرف ستائیس روپے سے کم ماہوار میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ اِس کے یہ معنی ہیں کہ سب ہندُستانی ایک روپے روز سے بھی کم

میں گزر کرتے ہیں ۔

یہ ہے اُن کی فاقہ کشی اور مُفلسی کی کیفیت اور یہ ہے اُن کے غلیظ اور بدبُودار جھونپڑوں کی حالت ۔ اُن کے چھوٹے چھوٹے دودھ پیتے بچّے ایک سال کے اندر اندر ہی کیڑے مکوڑوں کی طرح مر جاتے ہیں اور یہ افسوس ناک واقعہ شیر خوار بچّوں کی موت یا "کم سنی کی شرحِ اموات" (infant mortality) کے نام سے موسُوم کیا جاتا ہے ۔ تمھیں اِس تصویر کے دیکھنے سے پتا چلے گا کہ اِس



قسم کے واقعات بمقابلہ سویڈن کے ہمارے مُلک میں چار گنا زیادہ ہوتے ہیں ۔

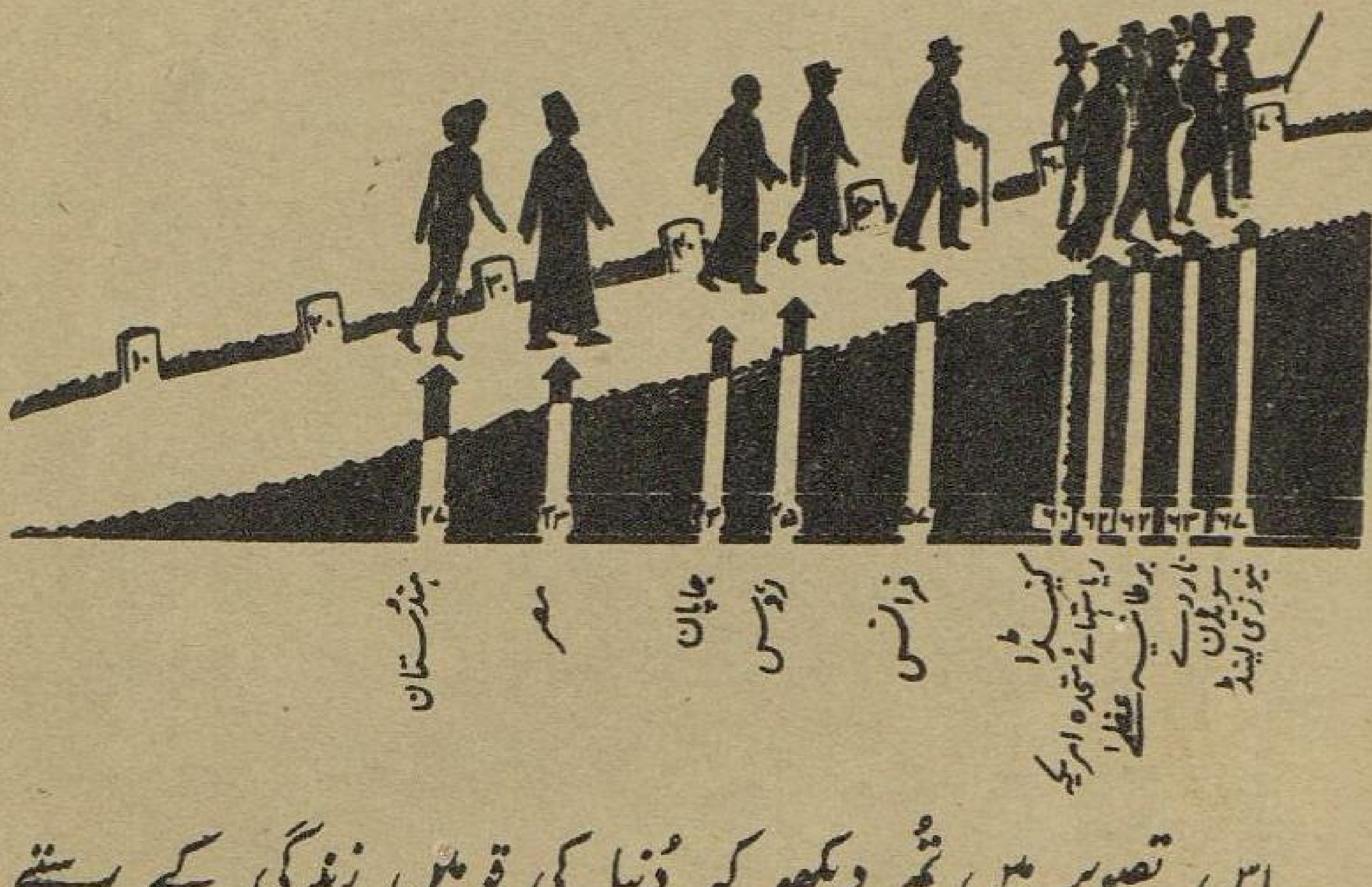
خیر، اب یہ بتاؤ کہ تُم کتنے زمانے تک اور زندہ رہنا چاہتے ہو؟ تم کہوگے ستّر یا کم سے کم ساٹھ سال تک ۔ دیکھو ! زیادہ اُمّید رکھنے میں کوئی برائی نہیں ہے ! مگر اِس موقعے پر مجھے افسوس کے ساتھ



کہنا پڑتا ہے کہ تُم سب مدرسے کے لڑکوں یا لڑکیوں کی اوسط زندگی کم و بیش تیس سال ہے!

کیوں! تمھیں یہ بات بُری تو نہیں لگی!! بھلا اِس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے! تُم تو خوش قسمت ہو کہ اپنی پیدایش کے پہلے سال ہی موت کے پنجے سے بچ گئے۔

مگر میں تُم سے ایک بات اَور کہتا ہوں۔ اُسے اچھی طرح سے یاد رکھنا۔ وہ بات یہ ہے کہ اگر تُمھارے ہاں کوئی چھوٹا بھائی یا بہن پیدا ہو تو کبھی بھُول کر بھی اپنے ماں باپ سے یہ ذکر نہ کر دینا کہ وُہ ستائیس سال کی عُمر میں مر جائے گا۔ اُن کو اِس بات سے رنج ہوگا۔ اِس لیے کہ بڑے بوڑھے ایسی باتوں سے خفا ہو جاتے ہیں!



اِس تصویر میں تُم دیکھو کہ دُنیا کی قومیں زندگی کے رستے پر

کس طرح چلی جا رہی ہیں۔ فرانسیسی ساٹھ سال کی عُمر تک لمبے لمبے قدم مارتا ہُوا چلا جا رہا ہے اور نیوزی لینڈ والا ستر سال کا ہے مگر کیسا لکڑی ہلاتا کھٹ کھٹ کرتا چلا جا رہا ہے۔ اب ذرا بیچارے ہندُستانی کو دیکھو، وہ ابھی تیس سال پر بھی نہیں پہنچا کہ ڈھیر ہو گیا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ بھلا سب ہندُستانی دُوسری قوموں کی طرح کیوں نہیں جیتے اور میرے ملازم دوست کی طرح زندگی کا لُطف کیوں نہیں اُٹھاتے؟ کیا وہ اُتنی محنت سے کام نہیں کرتے جتنی کہ یہ کرتا ہے؟ بے شک ایسا ہی کرتے ہیں، بلکہ اُن میں ہزاروں تو ایسے ہیں جو مُشکل سے مُشکل اور سخت سے سخت کام بھی انجام دیتے ہیں لیکن اِس پر بھی وُہ نہایت غریب اور مُفلس ہیں! آخر اِس کی کیا وجہ ہے؟ وجہ یہ ہے کہ بدقِسمتی سے ہمارے رہنے سہنے کے طریقے اور ہمارے ہاں کے اِنتظامات کچھ ایسے ہیں کہ محنت کرنے والوں کو اُن کی محنت کا پُورا پُورا معاوضہ نہیں مِلتا۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہو اور ہم سب کی آمدنی برابر کر دی جائے تو ہمارے کالج کے پروفیسر کہتے ہیں کہ ایسی صُورت میں ہم میں سے ہر ایک کی آمدنی چونسٹھ (۶۴) روپے چھے آنے سالانہ سے (جو آج کل ہمارے ہاں کی کثیر آبادی کی موجودہ آمدنی ہے) اٹھتر (۷۸) روپے سالانہ یا چھے روپے آٹھ آنے ماہانہ ہو گی۔ اب آؤ اِس آمدنی کی جانچ ایک ایسے خاندان پر کریں جس میں عام طور سے پانچ افراد ہوتے ہیں۔ اب ہمارے مُلک کی پیداوار کا مناسب لحاظ کیا

جائے تو ہمارے ہندُستانی صاحب کو سال بھر میں ۳۹۰ (۵×۷۸ء)
روپے یا بتّیس روپے آٹھ آنے ماہوار سے زیادہ نہیں ملیں گے
جس میں اُس کو اپنے علاوہ اپنی ایک بیوی، دو لڑکیاں اور ایک
لڑکے کو پالنا پڑے گا۔ اگر حساب کروگے تو نتیجہ یہ نکلے گا، کہ
ایک ہندُستانی خاندان کی گُزر کے لیے، جس میں بوڑھے بچّے مِلاکر
پانچ افراد ہوتے ہیں، کم و بیش ایک رُوپیہ ملتا ہے!

کیا ہمارا مُلک اس قدر تباہ حال ہے کہ وہاں بچّے بھوکوں
مریں؟ کیا یہ ایسی ویران جگہ ہے کہ جس کی سطح پر تو تھوڑا بہت
کچُھ پیدا ہوتا ہے مگر تہ کے اندر کچُھ بھی نہیں؟ کیا قُدرت ہم سے
اِس قدر خلاف ہے؟

تُم زور سے کہوگے کہ "ہرگز نہیں"! اِس لیے کہ تُم دیکھ چُکے
ہو کہ ہمارا مُلک دُنیا کا بدنصیب خِطّہ نہیں؛ بلکہ قُدرت نے اُس کو
ایک وسیع رقبہ دیا ہے جہاں خوش گوار اور مُختلف قسم کی آب و ہوا
ہے، جہاں زرخیز زمین اور پانی کثرت سے ہے، جس کی تہ میں
معدنیات کے قیمتی خزانے چھُپے ہوئے ہیں، جس کی سطح پر گنُجان
جنگل لہرا رہے ہیں، جہاں کثرت سے مویشی ہیں اور سب سے
بڑی بات یہ کہ جہاں کی آبادی اِنسانی آبادی کا پانچواں حِصّہ
ہے۔ جو عقل، سمجھ اور دُوسری چیزوں میں کسی طرح دُوسری قوموں
سے پیچھے نہیں اور جو اعلےٰ تمدّن اور پُرانی تہذیب کی مالک ہے۔

اِس طرح ہندُستان ایک بالکل اُلٹی بات ظاہر کر رہا ہے۔ اِس
قدر زرخیزی اور اِس قدر غُربت! یہ تو ایک گورکھ دھندا ہے۔



لیکن تُمھیں معلوم ہے کہ ہر گورکھ دھندے میں اُس کے کھولنے کا ایک اشارہ بھی ہوتا ہے۔

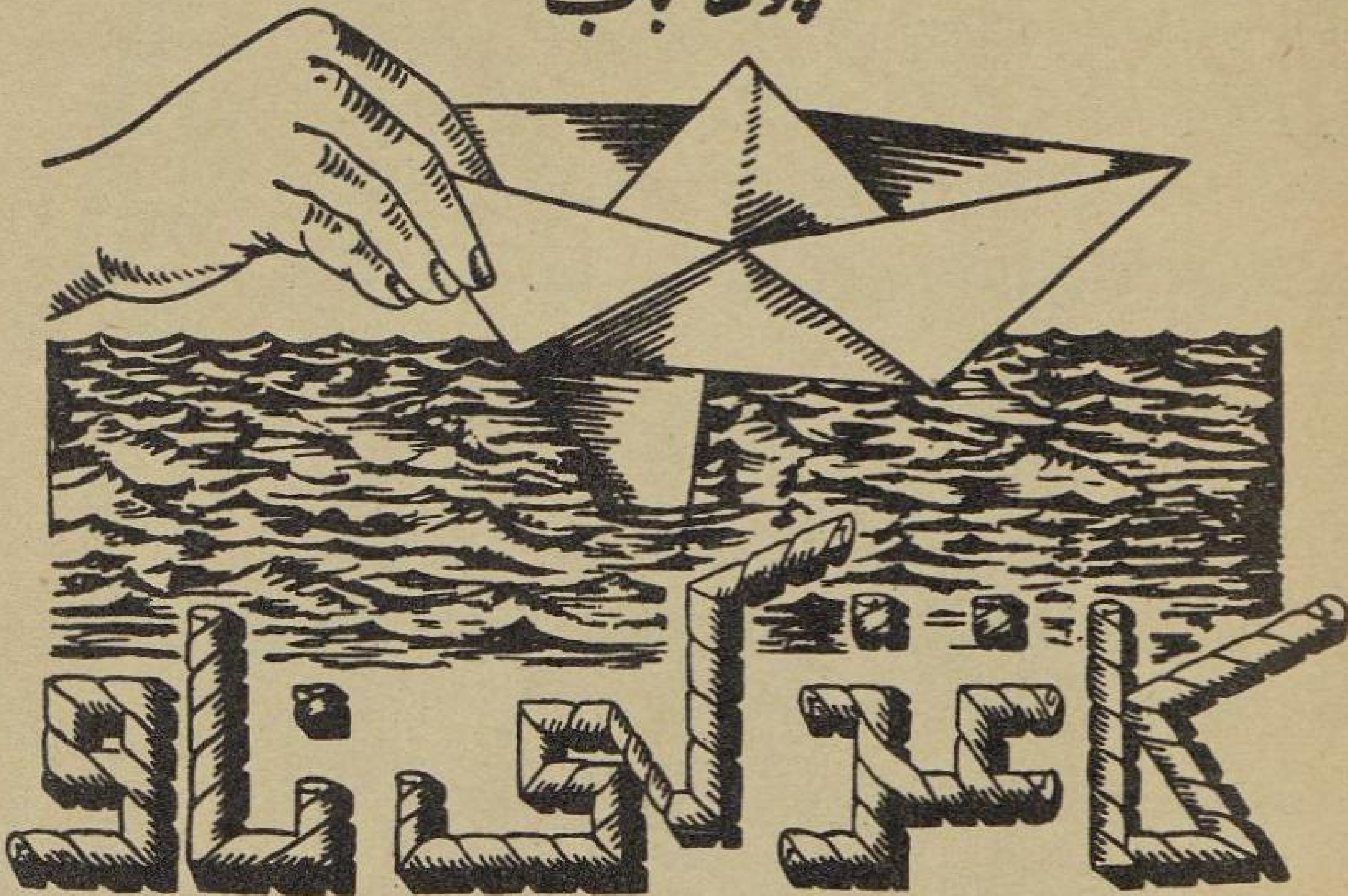
اِس کتاب میں تُمھیں بیسیوں اشارے مِلیں گے اور تُمھارے نوجوان اور تازہ دِماغ جو معمّے حل کرتے رہتے ہیں آخر میں خود کہیں گے "واہ یہ گورکھ دھندا تو نہایت ہی آسان تھا!"۔ اور سچ پوچھو



تو یہ بہُت آسان ہے۔ حالانکہ بڑے بڑے مدبّر اور سیاست دان اور معاشیات کے ماہر اور کارخانوں کے مالک اور دُوسرے سمجھدار لوگ نااُمیدی سے سر ہلاتے ہیں اور کبھی اِس کو حل کرنے کی کوشش کرتے بھی ہیں تو پھر بھی وہیں کے وہیں رہتے ہیں۔

پھر بھی یہ گورکھ دھندا بہت آسان ہے مگر شرط یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مل کر اُس کا حل تلاش کریں۔ یہ اِتنا اہم مُعاملہ ہے کہ ہم اگلے باب میں اُس کو حل کرنے کے لیے چند اور نکتے بتائیں گے ؎

چوتھا باب



اگر میں تم سے ایک ٹھیٹھ ہندُستانی کی تصویر بنانے کو کہوں تو بتاؤ کہ اُس کی وضع قطع کیا ہوگی ؛ تم اُسے کیا کام کرتا ہُوا دکھاؤ گے ؟

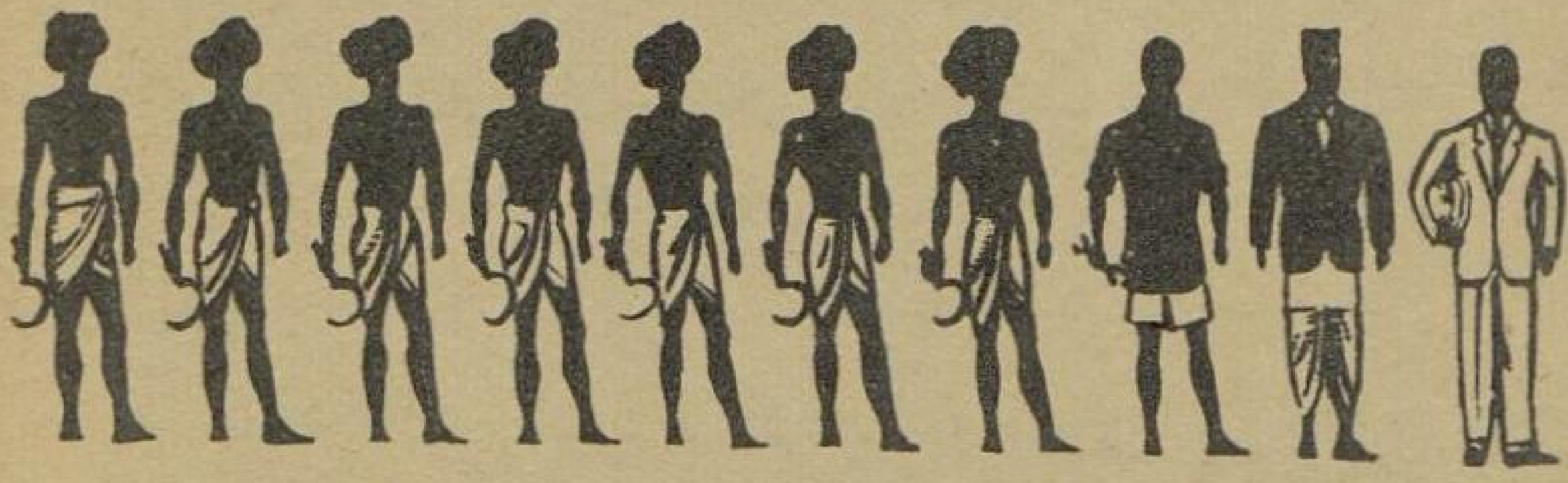
تم اُسے کوٹ پتلون پہنا کر میز پر بٹھاؤ گے ؛ یا چوڑی دار پاجامہ لمبی شیروانی ، سر پر پگڑی اور پاؤں میں سلیم شاہی جُوتا پہنے ، سڑک پر مٹر گشت کرتا ہُوا دِکھاؤ گے ؛ یا سفید بُراق کُرتے اور دھوتی میں، سر پر گاندھی ٹوپی اوڑھے ہوئے بتاؤ گے ؟

میں تو ایک لکیر بھی کھینچنا نہیں جانتا ، لیکن خوش قسمتی سے مُجھے ایک مصوّر مل گیا ہے جس نے ہمارے ہندُستانی کی ایک تصویر



بنا دی۔ اُس کا دھڑ ننگا ہے، پاؤں میں جُوتا نہیں، سر پر ایک ذرا سی پگڑی، کمر میں ایک لنگوٹی اور ہاتھ میں ایک درانتی ہے۔ بس یہ پوشاک ہے جو وُہ پہنتا ہے۔ یہ ہے اُس ہندُستانی کا حُلیہ جو میری نظروں میں ہے ۔

اگر دس ہندُستانی اِس مُلک کی تمام آبادی کے نمایندوں کے طور پر ایک قطار میں کھڑے کر دیے جائیں، تو اُن میں سات ہمارے ہندُستانی کی طرح ہوں گے۔ کسان، یعنی جو کھیتی باڑی کرتے ہیں؛ آٹھواں کسی کارخانے کا مزدُور ہوگا؛ نواں کوئی دُکاندار یا اہلکار ہوگا؛ اور دسواں سوداگر یا زمینڈار یا ڈاکٹر ہوگا ۔



درحقیقت یہ اُن سوالوں کے جواب ہیں جو حکومت کی جانب سے ہر دسویں سال ہم سب سے کیے جاتے ہیں اور ہر ایک کا نام، عُمر اور پیشہ دریافت کیا جاتا ہے۔ ایسی تحقیقات کو مردم شماری (census) کہتے ہیں اور یہ ۱۹۲۱ء میں پھر ہوئی ہے ۔

مردم شماری سے پہلی بات تو ہمیں یہ معلوم ہوتی ہے، کہ

ہندستان میں تقریباً ہر سو میں نوّے آدمی گانو کھیڑوں میں رہتے ہیں جن میں سے بہتّر آدمیوں کی روزی کا ذریعہ کاشتکاری یا زراعت ہے۔ چنانچہ اِس قسم کے کروڑوں آدمی سات لاکھ سے زیادہ گانو کھیڑوں میں آباد ہیں۔



یہ ضرور ہے کہ اِن آدمیوں میں سب کے سب؛ یعنی نوجوان بھی خود اپنے ہاتھ سے کاشت نہیں کرتے۔ اِن میں چند بڑے زمیندار ہیں جن کی زمینیں اُن کے باپ دادا کے زمانے سے چلی آ رہی ہیں اور اُن میں سے بہت سے یہ بھی نہیں جانتے کہ زراعت کِس چڑیا کا نام ہے۔ کچھ آدمی اُن کے نوکر ہیں جو کسانوں سے تحصیل وصول کرتے ہیں۔ اُن کے بعد چھوٹے چھوٹے زمیندار ہیں جو خود کام کرتے ہیں یا مزدوروں سے کام لیتے ہیں۔ گانو کے نزدیک رہنے والوں کی ایک بڑی تعداد ایسے اشخاص کی بھی ہے جو چھوٹے موٹے کاشتکار ہوتے ہیں۔ اُنھیں انگریزی میں (ryots) یعنی رعیّت کہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی اراضی خود کاشت کرتے ہیں یا کسی زمیندار کے پاس محنت مزدوری کرتے ہیں۔ گانوؤں میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے جن کے پاس چپّہ بھر زمین بھی نہیں ہے۔ ۱۹۲۱ء میں ایک ہزار زمینداروں کے مقابلے میں دو سو اِکیانوے ایسے مزدور تھے جن کے پاس ذرا سی زمین بھی نہیں تھی۔ ۱۹۳۱ء میں اِن کی تعداد بڑھ کر چار سو سات

ہوگئی۔ اِس حساب سے ہر تین کاشتکاروں میں ایک سے زیادہ ایسے آدمی ہیں جن کے پاس زمین بالکل نہیں ہے اور وُہ یہی تین چار آنے روزانہ کی مزدوری کرنے پر مجبور ہیں ٭

دُنیا میں شاید ہی کوئی ایسا مُلک ہوگا جہاں اِتنی بڑی آبادی کا گزارا صرف کھیتی باڑی پر ہی ہو۔ بہت سے ایسے مُلک ہیں جن کے دیہات میں نہ تو آبادی کی "اِس قدر کثرت" ہے اور نہ شہروں میں "اِس قدر قلّت"۔ بہُت سے مُلک ایسے ہیں جہاں ہر سو آدمیوں میں صرف پچیس آدمی، یعنی کُل آبادی کا صرف ایک چوتھائی حِصّہ زراعت کرتا ہے۔ اِس کی مثال ریاست ہائے متّحدہ امریکہ ہے۔ بہُت سے مُلک ایسے بھی ہیں جہاں ہر سو میں صرف دس ہی آدمی کھیتی باڑی کرتے ہیں اور باقی شہروں میں آباد ہیں۔ یہ سب کے سب کارخانوں، دُکانوں اور دفتروں میں ملازمت کرکے گزر بسر کرتے ہیں۔ اِس قسم کے مُلکوں کی مثال انگلستان ہے ٭

زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ انگلستان بھی ایک ایسا مُلک تھا جس میں دیہات کی کثرت تھی۔ تقریباً سو سال کا عرصہ ہُوا کہ انگریزوں نے نہایت تیزی کے ساتھ کارخانے بنائے اور بڑے بڑے شہر آباد کرنے لگے۔ اور انگلستان ایک ایسے دور سے گزرنے لگا جسے تُمھاری تاریخ کی کتابوں میں صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) کے نام سے بیان کیا گیا ہے۔ اِس دَور کا یہ نام بھی عجیب و غریب ہے کیونکہ انقلاب تو دم بھر میں ہو جایا کرتا ہے۔ مگر یہ انقلاب تو دو سو سال تک برابر ہوتا رہا اور بعض لوگوں کی رائے ہے کہ اُس کا سلسلہ

اب بھی جاری ہے ۔

کیا ہندُستان بھی اِسی قسم کے دَور سے گزُرے گا ؟ کیا اِس کے کسان بھی شہروں میں جاکر بسیں گے اور کارخانوں میں کام کریں گے؟ یہ ایک بڑا اہم سُوال ہے جس کا مجھے اور تمھیں جواب دینا چاہیے۔ لیکن ابھی نہیں بلکہ اِس کتاب کے آخر میں اس پر غور کریں گے ۔

یہ ایک کُھلی ہوئی بات ہے کہ ہندُستان میں خواہ کیسا ہی تغیرّ اور انقلاب ہو مگر آثار یہ کہتے ہیں کہ غالباً یہ ہمیشہ کسانوں اور دیہاتیوں کا مُلک رہے گا اور یہاں کے رہنے والوں کو زمین اور اُس کی پیداوار پر اُسی طرح گزُر کرنی پڑے گی جس طرح کہ آج کل کی جا رہی ہے ۔

دیکھو ہماری آبادی[1] بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے - میں کہتا ہوں کہ اگر ہماری صنعتیں اور شہر بھی اِسی رفتار اور تیزی سے بڑھے تو موجُودہ آبادی تو رہی ایک طرف ، ہماری زائد آبادی کی کھپت بھی اِن میں مُشکل سے ہو سکے گی ! چنانچہ ایک کتاب " اِنڈیاز ٹیمنگ ملینز" (India's Teeming Millions) میں ہندُستان کی بے حساب آبادی کے متعلق یہ بتایا گیا ہے کہ ۱۹۴۸ء میں ہماری آبادی کسی طرح ساڑھے بیالیس کروڑ سے کم نہیں ہوگی اور ہمارے بعض جوشیلے لوگوں کے خیال کے مطابق ہماری صنعتیں چاہے کتنی ہی تیز رفتاری سے کیوں نہ ترقی کریں ، مگر موجُودہ آبادی کی طرح ہماری زندگی کا

---

[1] ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مقابلے میں ۱۹۴۱ء میں تقریباً پانچ کروڑ آدمیوں کا اضافہ ہُوا۔ یعنی بمقابلہ گزشتہ ۱۵ فی صدی آبادی بڑھ گئی ۔ مترجم

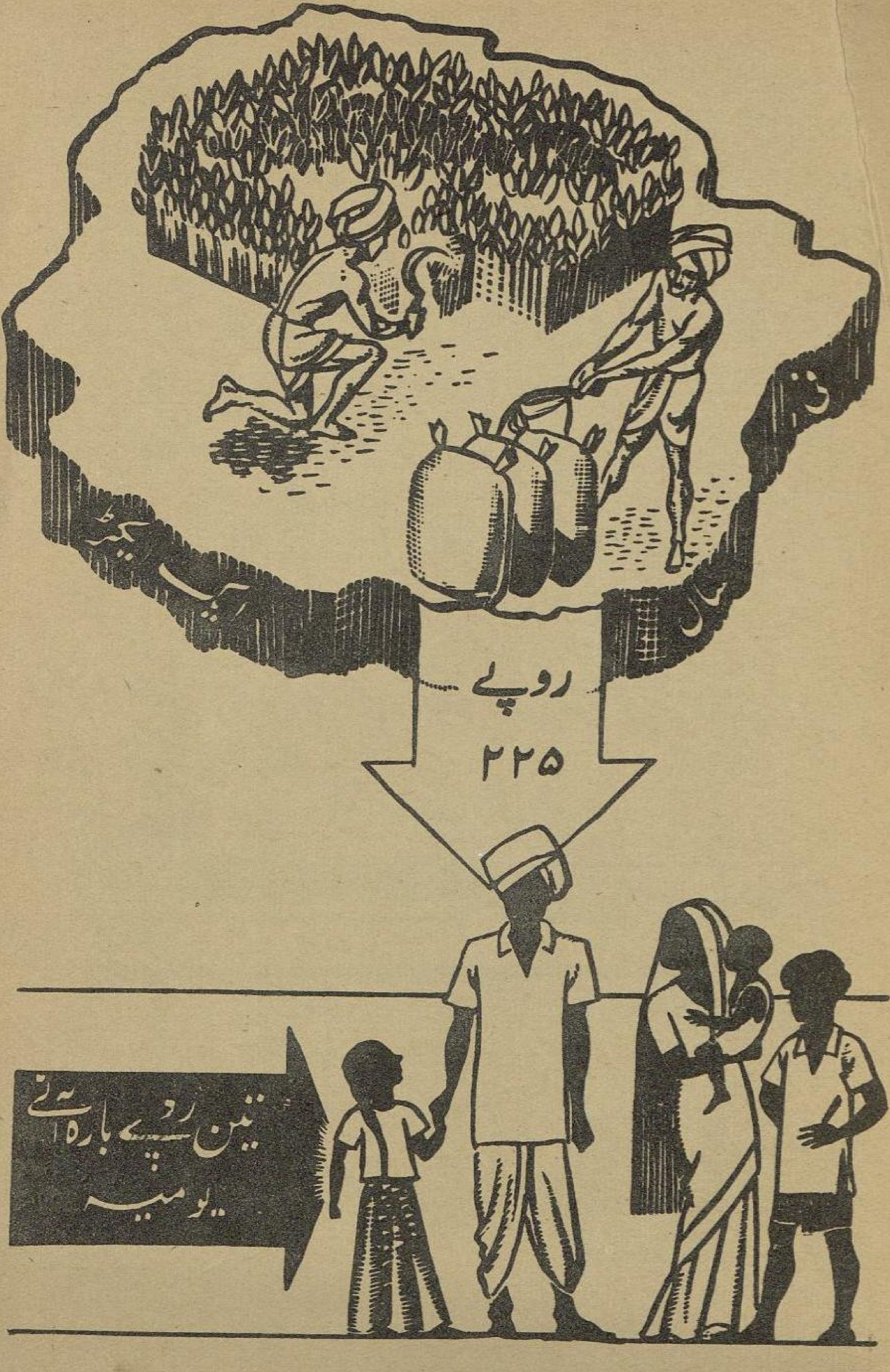
دار و مدار ہمیشہ کھیتی باڑی اور زراعت پر ہی رہے گا۔

اگر ہم اِس گورکھ دھندے کو حل کرنا چاہیں، جس کا ذکر ہم نے اِس کتاب کے ابتدائی حصّے میں کیا ہے، تو پہلے ہمیں اپنی زمین اور اپنے آدمیوں کے مسئلے اور پھر یہاں کی پیداوار کے متعلق بحث کرنی پڑے گی۔

ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ ہمارا مُلک بہُت وسیع ہے۔ یہہ وُسعت میں انگلستان اور ویلز سے چالیس گُنا بڑا ہے۔ لیکن ہم اِس کی "پوری زمین" پر کھیتی باڑی نہیں کر سکتے۔ اِس کے بعض حِصّوں میں شہر اور قصبے آباد ہیں۔ یہاں تک کہ دیہاتی رقبوں میں بھی سکونتی مکانات موجود ہیں۔ بعض حِصّے پتھریلے اور پہاڑی ہیں، بعض نشیبی ہیں، بعض دلدلی، بعض خُشک اور بعض ریتلے ہیں۔ اِن تمام حِصّوں کو چھوڑ کر بھی ہماری زمین کا تین چوتھائی حصّہ قابلِ کاشت ہے، جہاں ہم کُچھ نہ کُچھ پیدا کر سکتے ہیں۔

یہہ تو ایک نہایت وسیع رقبہ ہے۔ اگر ہم اپنی زمین سے اُتنی ہی مقدار میں پیداوار حاصل کریں جتنی کہ انگریز اپنی زمین سے حاصل کرتے ہیں تو ہم ایک ایکڑ میں دو سو پچیس روپے سالانہ قیمت کی فصل اُٹھا سکتے ہیں۔ اور کیوں نہ اُٹھائیں، ہماری زمین قُدرتی طور پر زرخیز ہے اور ہمارے لوگ سمجھ بُوجھ میں انگلستان کے لوگوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔

تُم کُچھ سمجھے بھی کہ روپے پیسوں میں ہمارے اور تُمھارے لیے اِس کا کیا مطلب ہے؟ تقریباً دو سو اٹھتر روپے سالانہ یا بارہ آنے


روپے
۲۲۵
تین روپے بارہ آنے
یومیہ

روزانہ فی کس - اِس طرح ایک ایسے خاندان کے لیے جس میں پانچ افراد ہوں، صرف زمین کی آمدنی، تین روپے بارہ آنے روزانہ ہوگی اور صنعتی کام کاج، کھاد اور جانوروں کا منافع اِس کے عِلاوہ ہوگا۔

مگر یہاں ایک اور ناگہانی مُشکل آ پڑی ہے - ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک ہندُستانی خاندان کی آمدنی جو پانچ افراد پر مشتمل ہو، ہر ممکن ذریعے سے صرف ایک روپیہ روزانہ ہوتی ہے - یا دُوسرے لفظوں میں یُوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ اُس آمدنی کا تقریباً ایک چوتھائی حِصّہ ہے جو کہ اُسے زمین کی پیداوار سے ہو سکتی ہے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ہو گئی ہے۔

جب ہم اِس مُعاملے کی چھان بین کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ ہماری زمین سے اِنگلستان کی زمین کی طرح دو سو پچّیس روپے کی آمدنی نہیں ہوتی - اِس لیے ہمارا خوش حال گھرانا کاغذ کی ناو کی طرح ڈُوب جاتا ہے۔



اِس سے پتا لگتا ہے کہ ہماری قابلِ کاشت زمین کا رقبہ ایک چوتھائی سے لے کر ایک تہائی تک بے کار پڑا ہُوا ہے - اور جو مزروعہ رقبہ ہے اُس میں بھی ایک ایکڑ زمین میں بجائے دو سو پچّیس

روپے کے صرف چھپن روپے کی مالیت کے لگ بھگ پیداوار ہوتی ہے جو انگلستان کی پیداوار کا ½ اور جاپان کی پیداوار کا ¼ حصّہ ہے۔

غلّے کی ایک اچھی مثال ہے۔ انگلستان میں ایک ایکڑ زمین میں ۲۵ من غلہ سالانہ پیدا ہوتا ہے اور ہندستان میں صرف ۸½ من کے قریب۔ یا گنّے کو لو جس کو تم بڑے شوق سے چوستے ہو۔ جاوا میں ایک ایکڑ زمین میں ۴۰ ٹن یعنی تقریباً ۱۱۲۰ من گنا ہوتا ہے اور ہندستان میں صرف ۱۰ ٹن یعنی تقریباً ۲۸۰ من۔ روئی کھانے کی چیز نہیں ہے مگر وہ ہمارے دیس کی سب سے بڑی "تجارتی پیداوار" ہے۔ ہم ایک ایکڑ زمین میں ۹۸ پونڈ یعنی تقریباً سوا من روئی پیدا کرتے ہیں، مگر ریاستہائے متحدۂ امریکہ میں ایک ایکڑ زمین میں ۲۰۰ پونڈ یا اڑھائی من روئی پیدا



ہوتی ہے اور مصر میں تو اس سے بھی زیادہ؛ ۴۵۰ پونڈ یعنی ساڑھے پانچ من فی ایکڑ۔

کیا میں نے غلطی کی جو تمہیں اپنی خوش حالی کے سبز باغ دکھائے اور تمہارے حوصلے بڑھائے۔ میں سچ کہتا ہُوں کہ مجھے اِس کا رتی برابر بھی رنج نہیں۔ اِس لیے کہ اگر ہماری زمین" انگلستان کی سرسبز زمین" کے مقابلے میں کم ہوتی۔ یا ہمارے ہاں کے لوگ جنگلی ہوتے تو اور بات تھی۔ مگر معاملہ برعکس ہے۔ اگرچہ ہمارے ہاں فی ایکڑ زمین میں ۲۲۵ روپے کی پیداوار "نہیں" ہوتی ہے لیکن میں دعوے سے کہتا ہُوں کہ ہم اُتنی پیداوار "کرسکتے" ہیں اور ہمیں اُتنی ہی پیداوار "کرنی چاہیے"؛

میرا یہ مشورہ ہے کہ ہمیں یہ کام کر دکھانے کے لیے کمر باندھ لینی چاہیے۔ کتاب کے صرف پڑھ لینے سے تو یہ کام نہیں ہوسکتا؛ اِس لیے ہمیں کام کی عملی راہ نکالنی چاہیے۔ اچھا آؤ، پہلے یہ تو پتا چلائیں کہ آخر ہم اپنی زمین سے پُورا پُورا فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتے۔ اِس میں یہ مُشکل ہے کہ اِبتدا کہاں سے کی جائے۔ یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہُوا ہے۔ تُم ہندُستان کی زراعت کے جس پہلو کو دیکھوگے اُس میں کچھ نہ کچھ خرابی ضرور نظر آئے گی۔

کسانوں کو دیکھو؛ وُہ فاقے زدہ، ان پڑھ اور جاہلِ مُطلق۔ پھر سال میں چھے مہینے گھر میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ مویشی؟ وہ اُن سے بھی زیادہ فاقے زدہ، مظلوم اور ناکارہ ہیں۔ کھیت؛ اگر اُنھیں دیکھو تو معلوم ہوگا کہ کاٹ کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے ہیں، پھر وہ ایسے ہلوں سے جوتے جاتے ہیں جو آج سے سیکڑوں برس پہلے اشوک اور گوتم بُدھ کے زمانے میں استعمال ہوتے تھے۔ اُن میں کھاد نام کو نہیں اور اُن کے قیمتی نمک یا

کھار کبھی کے ضائع ہو چکے ہیں۔ جو زمین دریا کے کنارے پر تھی اُس کی مٹی سیلاب سے بہ گئی۔ دوسری زمینیں پانی نہ ہونے سے خشک اور ویران ہیں۔ نہ تو جنگل پہلے کی طرح سرسبز اور گھنے ہیں نہ درخت ہی اُتنے بڑے ہیں۔

تُم پُوچھ سکتے ہو کہ "ایسی خراب حالت کیسے ہو گئی"؟ ابھی تو کہا جا رہا تھا "ہم ہندُستانی بڑے عقلمند ہیں" پھر یہ مُصیبت کیسی؟ اس کا جواب دینے کے لیے تمھیں اپنی تاریخ کے ورق اُلٹنے پڑیں گے۔ یاد رکھّو، ہم اِس وقت "آگے" کی طرف دیکھ رہے ہیں، "پیچھے" کی طرف نہیں۔ سب سے پہلے ہمیں اِس سُوال کو حل کرنا چاہیے کہ ہم اِس مصیبت سے کیسے نجات حاصل کر سکتے ہیں؟ ہم اپنی موجُودہ مصیبت سے ضرور بچ سکتے ہیں۔ اور اُس سے بھی کم مُدت میں جس کی عام توقّع کی جاتی ہے۔ بے شک لوگوں کی عادت ہے کہ وُہ اپنے قصُور دُوسروں کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ پنجاب میں یہ مثل مشہور ہے: "زمیندار کی بے عقلی، پرمیشر کا قصُور"! مگر واقعہ یہ ہے کہ ہماری مُصیبت میں قُدرت کا کوئی قصُور نہیں۔ قصُور اصل میں ہمارا ہی ہے۔ اگر تُمھیں اِس کا یقین نہ آئے تو میں آگے چل کر ثابت کر دُوں گا۔

گوبر

کہتے ہیں گوبر کا سب کھادوں سے بہتر کھاد ہے
لہلہا اُٹھتی ہیں اُس کے ڈالتے ہی کھیتیاں
حیف ہے گوبر جلا دیتا ہے دہقانی مگر
کیا کرے مجبور ہے لائے کہاں سے لکڑیاں
گو یہاں موجود ہے صحرا کا اِک رقبہ وسیع
سیکڑوں جس میں شجر ہیں اور لاکھوں بوٹیاں
ہیں جہاں پر دیودار و اوک اور شاہِ بلوط
پام، فرن و بانس، پائن اور ببول و ساگواں
ہوتی ہے اُس کی بدولت ہم کو آمد چھ کروڑ
دس کروڑ ایکڑ سے زائد اُس کا رقبہ ہے یہاں
دُور ہیں صحرا مگر یہ سب کے سب دیہات سے
اِس لیے گوبر جلا دیتا ہے بیچارہ کسان

(عصمت)

پانچواں باب

زمین کے کھار

انجیل میں دُنیا کے بہترین لوگوں کو "زمین کے نمک" سے تشبیہ دی گئی ہے۔ نمک کا استعارہ اُس چیز کے نہایت مُفید اور قابلِ قدر ہونے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

مگر تُم کہوگے "نمک زمین میں کہاں ہوتا ہے وہ تو سمندر کے پانی سے بنایا جاتا ہے"!

ہاں، یہہ سچ ہے جو نمک کہ ہم کھانے میں ڈالتے ہیں وُہ تو سمندر کے پانی سے ہی بنایا جاتا ہے یا کانوں[1] سے نکالا جاتا ہے مگر یہ نمک کی ایک قسم ہے۔ اِس کے علاوہ نمک کی اور بھی کئی قسمیں ہیں، جن میں سے بعض ہماری زمین میں موجُود ہیں اور اُنھیں ہم کھار کہتے ہیں۔ اُن میں سے چار کھار نہایت اہم ہیں جن پر پودوں کی پرورش اور درختوں کی زندگی کا انحصار ہے۔ یہہ نائٹروجن، پوٹاشیم، فاسفورس اور لائم کے نام سے مشہور ہیں۔ خیر اِن کے نام کُچھ بھی ہوں، نام سے کام نہیں؛ ہمیں تو اُن

---

[1] کئی جگہ نمک کانوں سے نکالا جاتا ہے؛ پنجاب میں کھیوڑے میں نمک کی کان ہے۔

کے عمل اور تاثیر سے کام ہے ؛

اِس سے پہلے ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ زمین پر جو کچھ اُگتا ہے وہ دھُوپ ، پانی ، ہوا اور مٹّی کے مُشترک عمل کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مگر زمین میں ایسی کیا چیز ہے جو اُنھیں اُگنے میں مدد دیتی ہے ؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ بس یہی "کھار"، جو ہماری زمین میں پائے جاتے ہیں۔ جب زمین کے کسی خاص حصّے میں یہ چاروں کھار کافی مقدار اور صحیح تناسب میں پائے جاتے ہیں تو وہاں پیداوار خوب تیزی سے ہوتی ہے اور وہ زمین زرخیز کہلاتی ہے مگر جہاں اِن میں سے چند یا سرے سے تمام کھار غائب ہوں تو ایسی زمین کو بنجر کہتے ہیں ؛

دوُسری تمام اچھّی چیزوں کی طرح زمین میں بھی قُدرتی کھار کا ذخیرہ کم و بیش محدود ہوتا ہے۔ ابتدا میں یہ کھار خاصی مقدار میں ہوتے ہیں اور گو اُن کی کمی قُدرتی طور پر تھوڑی بہت پوُری ہوتی ہے لیکن جب کاشت ہونے لگے تو وُہ برابر کم ہوتے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک ایکر زمین میں معمولی فصل پر تقریباً بیس پونڈ نائٹروجن سال بھر میں خرچ ہوتی ہے۔ اِس طرح جتنی زیادہ مقدار میں یہ کھار پودوں اور اناج کا جُزو بن کر نکلتا رہتا ہے، اُتنی ہی رمقدار میں زمین کے اندر اِس کی کمی ہو جاتی ہے۔ اور جس زمین میں یہ جتنا کم ہوگا اُس میں اُتنی ہی کم پیداوار ہوگی۔ گویا یہ قانون تقلیلِ حاصل (Law of Diminishing Returns) کے مطابق ہے ؛

تُم ضرور سوچتے ہوگے کہ پھر یہ کیا بات ہے کہ اِتنے زمانے

کے بعد اِس بیسویں صدی میں بھی زمین سے پیداوار کیسے ہوتی ہے۔ اِس قانون کے لحاظ سے تو اب تک دُنیا کی تمام زمینیں بنجر ہو جانی چاہیے تھیں اور ہم سب پر فاقہ گُذرنا چاہیے تھا! تُمھارا یہ خیال کُچھ زیادہ غلط نہیں ہے۔ واقعی یہ نوبت بھی پہنچ جاتی اور اِس قِسم کی کوئی نہ کوئی بلا ہم پر ضرور نازل ہوتی۔ مگر ایک چیز نے ہمیں بچا لیا! اور وہ یہ کہ انسان نے کسی نہ کسی طریقے سے ضائع ہونے والے کھار کے بدلے زمین میں دُوسرا کھار پہنچانے کا اِنتظام کر لیا ہے۔ وہ زمین میں راکھ، ہڈیاں، گوبر اور چُونا ملانے لگا، اِس طرح زمین کو پھر زرخیز بنا دیا۔ اِن چیزوں میں وہی کھار موجُود ہیں، جو فصلوں کے ساتھ اُن کے اجزا بن کر زمین سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اِس قسم کی چیزوں کو کھاد کہتے ہیں۔ کھار کو بچانے یا زمین کے کھار کی حفاظت کرنے کا دُوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک ہی کھیت میں باری باری سے مُختلف فصلیں بوئی جائیں۔ ہر فصل میں ایک خاص قسم کا کھار خرچ ہوتا ہے، اِس لیے زمین سے کوئی ایک کھار نِکل جاتا ہے۔ اِس طرح باقی کھار محفوظ رہتے ہیں اور خارج نہیں ہونے پاتے۔ کاشت کے اِس طریقے کو فصلوں کا "باری وار" طریقہ (rotation of crops) کہتے ہیں، جس پر ہندُستان میں صدیوں۔ یعنی اُس زمانے سے بہت پہلے سے، جب کہ اہلِ یورپ نے اِس طریقے کو سیکھا، عمل ہو رہا ہے۔

کبھی تُم کسی گاؤں میں سے بھی گُذرے ہو؟ نہیں، تو اب ضرور جاؤ! وہاں تُمھیں، جھونپڑیوں کی دیواروں پر قرینے سے گوبر تُھپا ہُوا



نظر آئے گا۔ بھلا کبھی تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ اِس گوبر کا کیا حشر ہوتا ہے؟ پہلے تو یہ کہ کچھ دھوپ سے سوکھ کر ہوا کے تھپیڑوں سے اُڑ جائے گا، کچھ جھونپڑیوں کا فرش اور دیواریں لیپنے کے کام آئے گا اور بہت سا ایندھن کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ یعنی دیہاتی اُسے چولہے میں جاکر اپنا کھانا پکائیں گے یا الاو میں ڈال کر جاڑے کے زمانے میں ہاتھ تاپیں گے۔

تم شاید مجھ سے پوچھوگے، "گوبر کا زمین کے کھار سے کیا تعلق ہے؟" سنو، تعلق یہ ہے کہ گوبر میں زمین کے کھاروں کی طرح کے کئی کھار ہیں اور یہ ایک بہترین قسم کا کھاد ہے۔ قدرت نے اِس طریقے سے ہمیں ایسی چیزیں عطا فرمائی ہیں، جن کی ہماری زمین کو ضرورت ہے۔ گانو کے مویشی کئی طریقوں سے ہماری خدمت کرتے

ہیں اور ایک اُن کی بڑی خدمت یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے کھاد مہیا کرتے ہیں ۔

لیکن ہم اِس کھاد سے کیا فائدہ اُٹھاتے ہیں ؟ خاک بھی نہیں، اُسے آگ میں ڈال کر جلا دیتے ہیں۔ گوبر کے علاوہ ، مونگ پھلی اور ہڈیوں سے بھی اچھا کھاد بنتا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ہم اُنھیں غیر مُلکوں کے ہاتھ بیچ ڈالتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں خود، اُن کی بے حد ضرورت ہے ! کون یقین کر سکتا ہے کہ ہمارے لاکھوں بُوڑھے تجربہ کار ایسے احمق ہیں ؟

اچھا چلو ، اب تم اُن سیدھے سادے کسانوں میں سے کسی ایک سے گوبر کے متعلق دریافت کرو۔ فرض کرو اُس کا نام راما ہے۔

تم : ارے بھئی راما ، تُم گوبر کو اپنی زمین میں ڈالنے کے بجائے آگ میں کیوں جلا ڈالتے ہو؟

راما : یہ ایندھن کا کام دیتا ہے ۔

تُم : ٹھیک ہے ، مگر اسے زمین میں ڈالو تو تُمھاری فصل اچھی ہوگی اور تمھیں زیادہ منافع ملے گا ۔

راما : (ناراض ہوکر) ہوگا ! مگر پھر میں اپنا کھانا کیسے پکاؤں گا؟

تُم : ہم تو اپنا کھانا گیس کے ذریعے سے پکاتے ہیں ۔

راما : (تعجّب سے) گیس ، یہ گیس کیا بلا ہے۔ میں نے تو آج تک نہ کبھی اِس کا نام سُنا ہے اور نہ آنکھوں سے دیکھا ہے!

تُم : (اصرار سے) اچھا گیس کو چھوڑو۔ کوئلے اور لکڑی کا نام بھی سُنا ہے یا وُہ بھی نہیں سُنا ۔

راما : کیوں نہیں، جنگل بھرے پڑے ہیں ؞
تم : تو پھر تُم لکڑی سے کیوں کھانا نہیں پکاتے ؟
راما : (ہنس کر) واہ ! اجی اُس میں تو پیسہ خرچ ہوتا ہے اور اُپلے ہمیں مُفت پڑ جاتے ہیں، کوڑی بھی خرچ نہیں ہوتی ؞
تُم : (دل ہی دِل میں) "عجب کوڑھ مغز آدمی سے سابقہ پڑا ہے۔ اب اِس کے دماغ میں بات کیسے اُتاروں"۔ اتنے میں تمھیں ایک ترکیب سوجھتی ہے اور تُم مُسکرا کر کہتے ہو، "کیا تمھارے پاس پانچ روپے کا نوٹ ہے ؟"
راما : (آزردہ ہو کر) نوٹ ووٹ تو میرے پاس نہیں ہے - ہاں جب فصل کاٹوں گا اور غلّہ بیچوں گا تب نوٹ ہاتھ آئے گا ؞
تم : اچھا، پھر تم اُس نوٹ کو پھاڑ دوگے یا آگ میں ڈال کر جلا دوگے ؟



راما : (یہ جُملہ سُن کر تمھاری بے وقوفی پر بے اختیار ہنس پڑتا ہے) نوٹ کیوں جلانے لگا۔ کیا میں پاگل ہُوں - یہ تُم نے کیا فضُول بات کہی ؟
تُم : کیوں، یہ بات فضُول کیوں ہے ؟
راما : فضول اِس لیے، کہ پانچ روپے کا نوٹ تو بہت بڑی چیز ہے اِس سے تو میں کئی کام لے سکتا ہُوں - اپنی ضرُورت کی کئی چیزیں خرید سکتا ہُوں ؞

تم : (مُسکراکر) بالکل ٹھیک ، مگر تمھاری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اِس گوبر سے بھی تم کئی اچھے کام لے سکتے ہو۔ پھر اُسے جلا کیوں ڈالتے ہو؟ دیکھو! اگر تم گوبر کو اپنے کھیت میں ڈالو تو اُس سے تُمھاری زمین میں طاقت آئے گی اور تُمھاری فصل تین گُنا اور چار گُنا زیادہ ہونے لگے گی۔ پھر تُمھیں ایسے پانچ پانچ روپے والے کئی نوٹ ہاتھ آئیں گے۔ اُن سے پھر جلانے کے لیے لکڑیاں ہی نہیں بلکہ اَور بھی بیسیوں چیزیں خرید سکتے ہو۔

راما : بھیا، یہ تو سچ کہتے ہو۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ جب میں زمین کو کھاد دیتا رہوں گا، فصل تیار ہوگی اور پانچ پانچ روپے کے نوٹ آنے لگیں گے، اُس وقت تک میں اپنا گھر کیسے چلاؤں گا اور کھانا کیسے پکاؤں گا؟

تم کو اُس کا فوراً کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اچھا تو تھوڑی دیر کے لیے راما کو اُس کے حال پر چھوڑو۔ اب ذرا الگ چلو؛ کھاد اور ایندھن کے متعلق کچھ اَور باتیں معلوم کر لیں اور پھر آکر اُس کی گتھی کو سُلجھائیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اگرچہ گوبر میں کئی کھار موجود ہیں، مگر زمین کو اِن کے علاوہ کئی اور چیزوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے اور وہ گوبر میں موجود نہیں ہیں۔ دُوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ گوبر مکمّل کھاد نہیں ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے کسی انگریز نے چڑیا گھر میں پہلی مرتبہ زرافہ[1] کو دیکھ کر کہا "کوئی اور ایسا

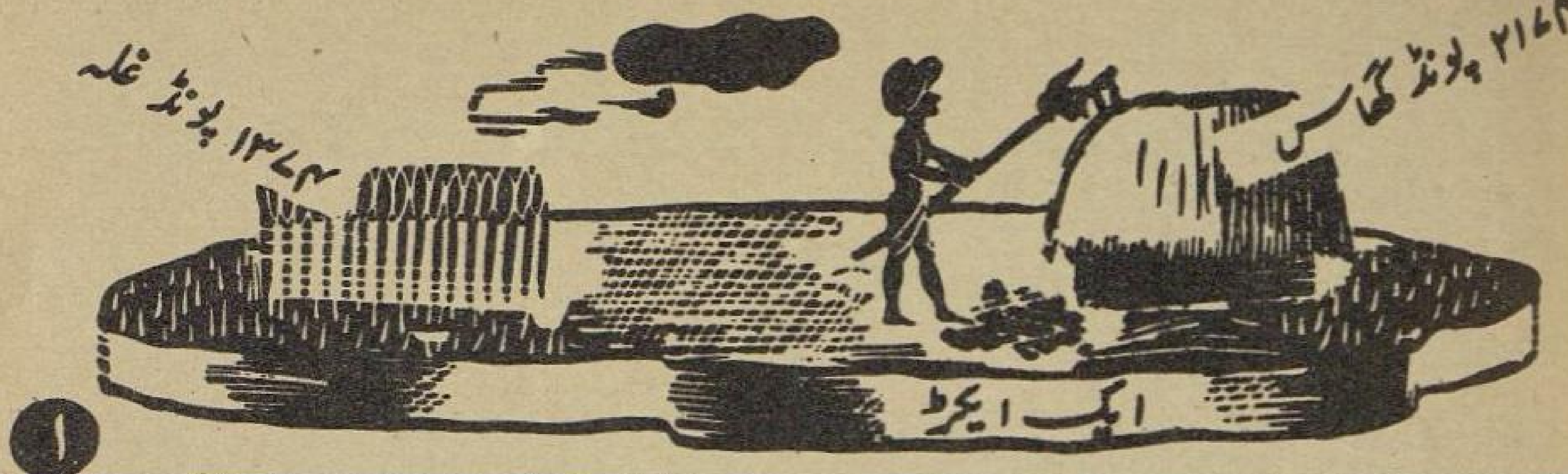
[1] زرافہ اونٹ سے ملتا جُلتا جانور ہے مگر انگلستان یا یورپ بھر میں نہیں ہوتا۔ مترجم

نہیں ہے!"

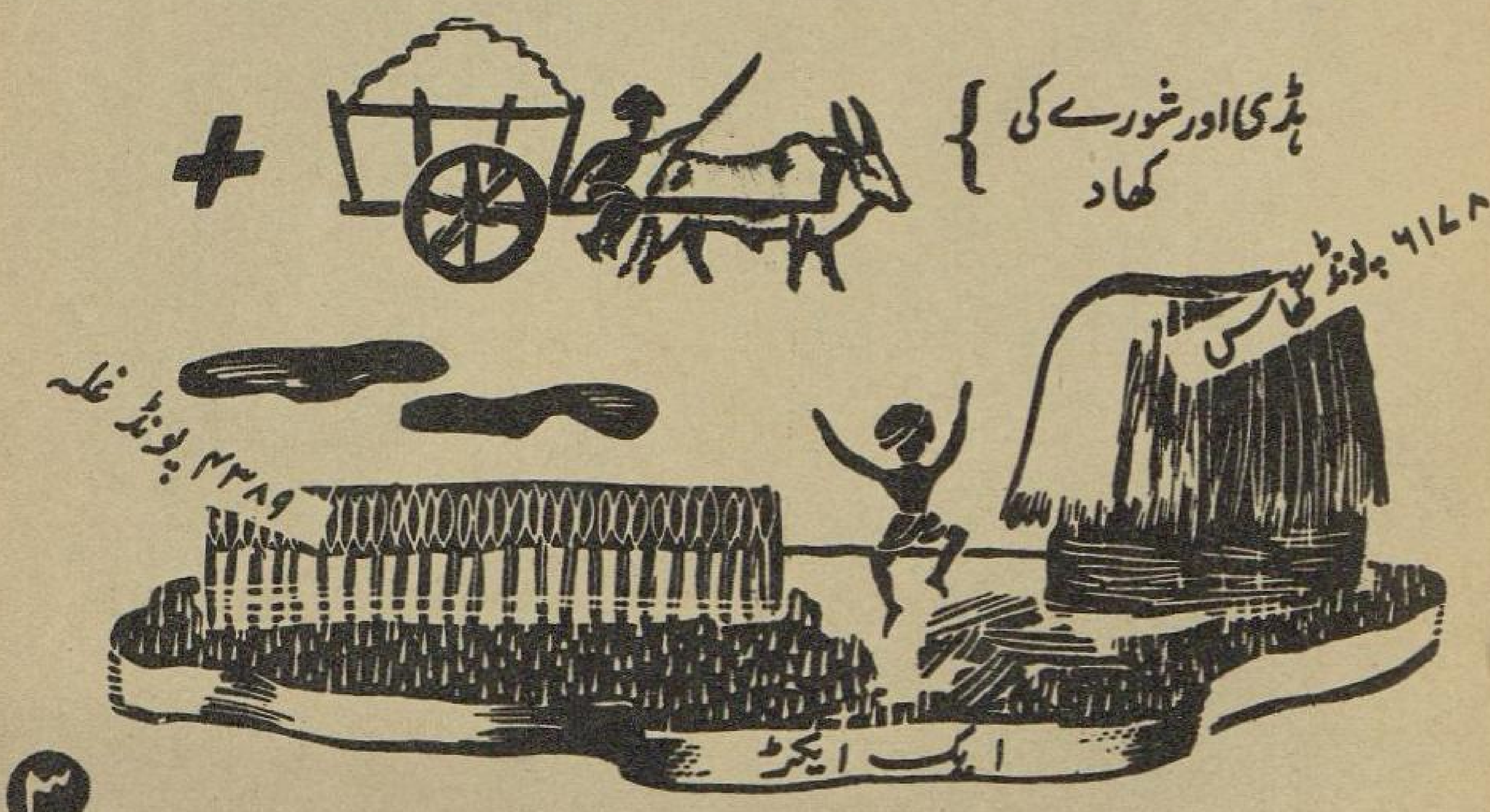
ہمیں یہ بھی معلوم ہُوا ہے کہ گوبر کیمیائی طور پر مُفید ہونے کے علاوہ طبعی طور پر بھی مُفید ہے۔ اس کا طبعی اثر جو زمین کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ بھاری مٹّی کو مسامدار اور ریتیلی کو غیر مسامدار یا بستہ بنا دیتا ہے۔ پھر یہ ایک نامیاتی کھاد ہونے کی وجہ سے ایسے جراثیم کی پیدائش میں مدد دیتا ہے جو پودوں کی نشو و نما کے لیے مُفید ہیں۔

لوگوں نے مُختلف قِسم کی کھادوں کی خصوصیتیں معلوم کرنے کے لیے بہُت کچھ تجربے کیے ہیں اور پتا چلایا ہے کہ کِس قِسم کی کھاد کا کیا اثر ہوتا ہے۔ میں اِس موقعے پر اُن میں سے ایک دو کا ذِکر کرتا ہوں، جس سے تمھیں معلوم ہوگا کہ زمین کی کاشت میں کھاد کی کیا اہمیت ہے۔

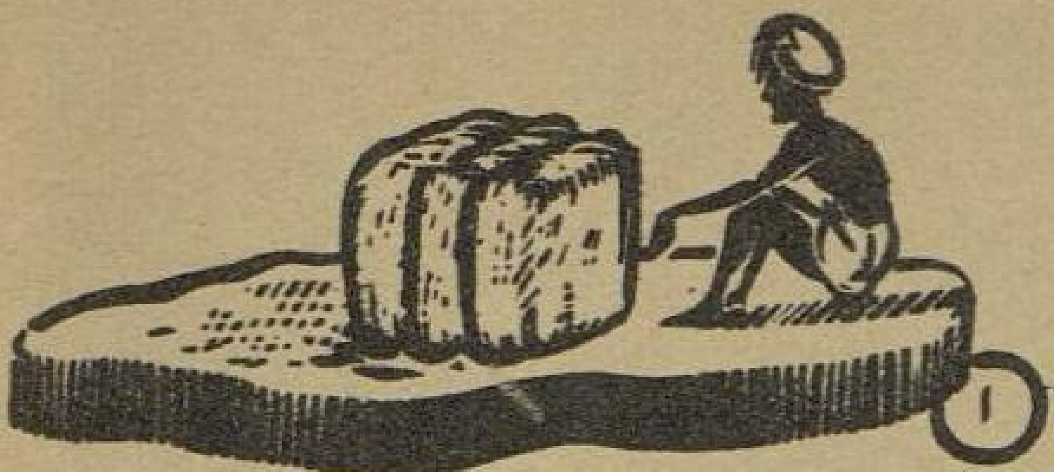
ایک ایکر زمین جس میں کوئی کھاد نہیں ڈالی گئی تھی، اُس میں ۱۳۷۴ پونڈ غلّہ اور ۲۱۷۴ پونڈ گھاس نِکلی۔ جب اُس میں چار ٹن کے قریب گوبر کی کھاد دی گئی تو اُس میں ۳۵۵۶ پونڈ غلّہ اور ۴۷۷۹ پونڈ گھاس پیدا ہوئی۔ کیوں! ہے نا تعجب کی بات؟ لیکن اِس سے بھی زیادہ تعجب کی بات سُنو! کچھ دِنوں کے بعد اُسی زمین میں گوبر کے بدلے ہڈّیوں اور شورے کی کھاد دی گئی تو فصل اور بھی اچھّی ہوئی اور ۴۳۸۹ پونڈ غلّہ اور ۶۱۷۸ پونڈ گھاس پیدا ہوئی۔ اب ذرا حساب تو کرو کہ اِسی ایک ایکر زمین میں


۲۱۶۴ پونڈ گھاس
۱۳۷۴ پونڈ غلہ
ایک ایکڑ
۱


گوبر
۴۷۷۹ پونڈ گھاس
۳۵۵۶ پونڈ غلہ
ایک ایکڑ
۲


ہڈی اور شورے کی
کھاد
۶۱۷۸ پونڈ گھاس
۴۳۸۹ پونڈ غلہ
ایک ایکڑ
۳

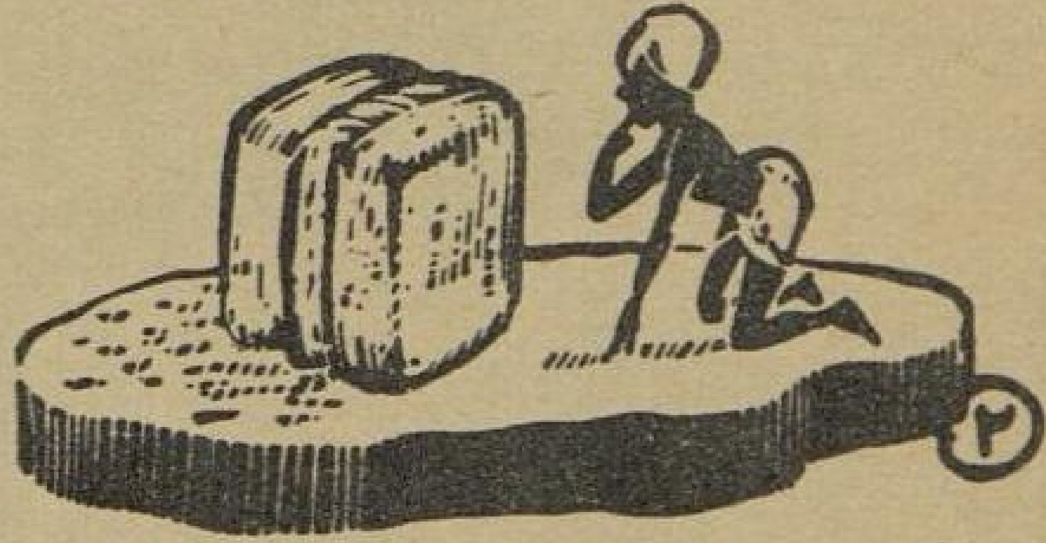
فی ایکڑ



۱

۴ ٹن (۱۱۲ من) گوبر

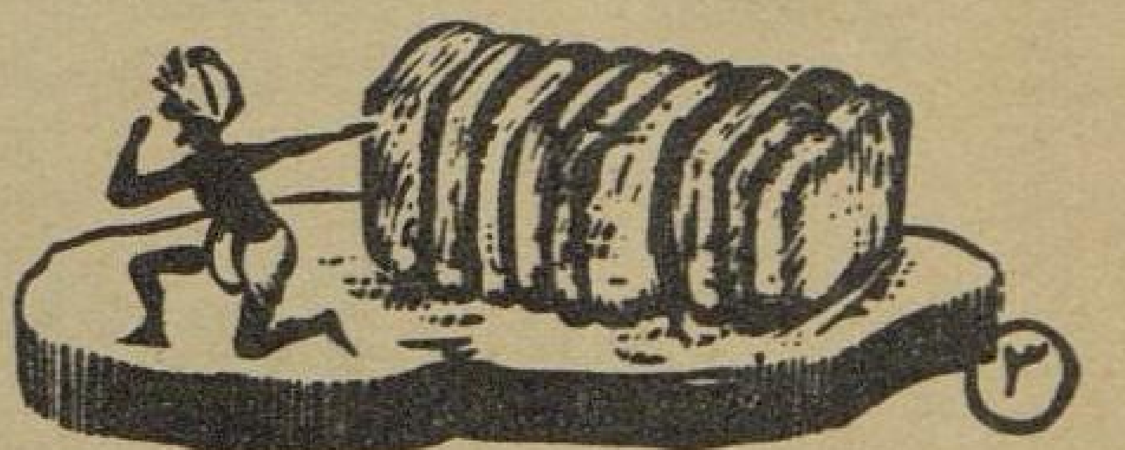




۲

ایک ہنڈرویٹ نائٹریٹ
ایک ہنڈرویٹ سوپر فاسفیٹس
ایک ہنڈرویٹ کائناٹ





۳

دو ہنڈرویٹ گراؤنڈ نٹ کیک
دو ہنڈرویٹ سوپر فاسفیٹس
دو ہنڈرویٹ کائنائٹ





۴

محض کھاد کی وجہ سے "تین گُنا" زیادہ پیداوار ہوئی ؛

اِس سے زیادہ عجیب و غریب واقعہ ایک اور کھیت کا ہے اُس میں بغیر کھاد کے ۵۰ پونڈ[1] روئی پیدا ہوتی تھی - لیکن جب اُس میں چار ٹن[2] کے قریب گوبر ڈالا گیا تو ۸۰ پونڈ روئی پیدا ہوئی - اُس کے بعد پھر بجائے گوبر کے ایک ہنڈرویٹ نائٹریٹ آف سوڈا ، ایک ہنڈرویٹ سُپر فاسفیٹس (superphosphates) اور ایک ہنڈرویٹ کائنائٹ (kainit) ڈالا گیا تو ۱۵۰ پونڈ روئی پیدا ہوئی - پھر اُسی زمین میں دو ہنڈرویٹ گراؤنڈ نٹ کیک (groundnut cake) دو ہنڈرویٹ سُپرفاسفیٹس اور دو ہنڈرویٹ کائینائٹ ملاکر ڈالا گیا تو ۲۰۰ پونڈ، یعنی پہلے سے چار گُنا زیادہ " پیداوار ہوئی ؛

تجربے سے ثابت ہُوا کہ سائنسی طریقے کا کھاد بہ نسبت گوبر کے بہت زیادہ عُمدہ ہوتا ہے - مگر راما کو پہلے یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ اُس کی زمین میں "کن کن" چیزوں کی کمی ہے یا اُس کی زمین کو "کون کون" سے کھاد کی ضرورت ہے - جس طرح ہر اِنسان کے لیے ایک ہی قسم کی غذا موزوں نہیں ہوتی ، اُسی طرح ہر زمین کے لیے ایک ہی قسم کا کھاد موزوں نہیں ہوتا - راما بیچارہ کیا جانے کہ اُس کی زمین کو کس چیز کی ضرورت ہے ! یہ تو کیمسٹ یعنی کیمیادان بتا سکتا ہے کہ اُس میں کس کھاد کی کمی ہے - مگر وُہ مُفت امتحان تھوڑی کرے گا - راما کو اُس کی فیس ادا کرنی پڑے گی !

---

[1] ایک پونڈ تقریباً آدھ سیر کے مساوی ہے ؛

[2] ایک ٹن تقریباً ۲۸ من کے مساوی ہے ؛ (مترجم)

اب فرض کرو کہ راما فیس بھی ادا کر دے اور اُسے یہ بھی معلوم ہو جائے کہ گوبر کے ساتھ دُوسری کیا کیا چیزیں ملانی چاہئیں تو پھر یہ بتاؤ کہ اب وہ اُن چیزوں کو کہاں سے لائے؟ اُس کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے، کیوں ہے کہ نہیں؟ بات یہ ہے کہ اگر راما کو صرف کھاد مل جائے، تو آیندہ فصل سے وُہ اِتنی رقم کما لے گا، کہ کھاد کی قیمت تو رہی ایک طرف، وُہ اپنے دُوسرے قرضے بھی چُکا دے گا۔ "کچھ سمجھے"؟ اِس وقت راما کو کھاد کی ضرُورت ہے، جس کی قیمت وہ آیندہ فصل سے ادا کر سکتا ہے۔ اب ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اُسے اُدھار کھاد دے۔ مگر افسوس کہ ہمیں کوئی بھی ایسا نظر نہیں آتا، جو اِس قِسم کا کاروبار کرتا ہو۔

تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لو کہ قسمت سے راما کو ایک ایسا سخی داتا مل جاتا ہے جو اُدھار کھاد دینے کے لیے تیار ہے، مگر اُسے گوبر جلانے کی اب بھی ضرُورت ہے۔ اِس کے بدلے اُسے کیا دیا جائے؟ گیس؟ گیس، شہر میں ہے گانو میں کہاں سے آئی۔ کوئلہ؟ کوئلہ بہُت مہنگا ہے۔ لکڑی؟ ہاں، لکڑی بیشک ہمارے مُلک میں کثرت سے ہے، مگر گانو میں بہُت کم ہے۔ خدا معلوم، وہاں اِس کا کیوں کال ہے؟ یہ دُوسری چھوٹی گُتھی ہے، جسے سُلجھانا ضروری ہے۔

جنگل ہمارا ایک انمول خزانہ ہے۔ ہمارے قابِل کاشت رقبے کا کوئی پانچواں حصّہ سرسبز اور ہرے بھرے جنگلوں سے بھرا ہُوا

ہے۔ اِن کے دس کروڑ ایکڑ کے رقبے سے ہر سال چھے کروڑ روپوں کی آمدنی ہوتی ہے۔ ہمارے ملک کی آب و ہوا میں درخت اور پودے اس قدر تیزی سے بڑھتے ہیں کہ اگر ہم ۲ ارب ۸۰ کروڑ من لکڑی بھی ہر سال کاٹیں تو سال ختم ہونے پر کسی قسم کی کمی نہیں ہونے پائے گی۔

یہ جنگل کا ایک گیت ہے، جسے عام طور پر گونڈ لوگ گاتے ہیں :-

لگاؤ آم اور لگاؤ اِملی؛ لگاؤ جام اور لگاؤ کیلے
ہوا کے جھونکوں میں ہل رہے ہیں جھکے ہوئے بوجھ سے پھلوں کے
لگاؤ باغوں میں خوب پودے، لگاؤ چنار اور تلسی
اگر نہ پانی سے اُن کو سینچا، تو پھر رہے گا نہ ایک باقی
مگر وُہ جنگل کے جھاڑ دیکھو، کھڑے ہیں جو رام کی دیا سے
وہاں نہ مالی ہے اور نہ پانی، وُہ جی رہے ہیں فقط ہوا سے

بعض کا خیال ہے کہ ہمارے تمام جنگل ہمالیہ میں واقع ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہاں سے اُس لکڑی کو مدراس لانے میں کتنا خرچہ ہوگا! ہاں یہ ضرور ہے کہ جنگل ہندُستان کے پُورے حصّوں میں مساوی طور پر بٹے ہوئے نہیں ہیں۔ ہمالیہ میں دیودار، صنوبر، بلوط، شاہ بلوط اور بانسوں کے بہترین جنگل ہیں؛ اِس کے برخلاف ہندُستان کے بعض حصّے ایسے بھی ہیں جہاں درخت نام کو بھی نہیں ہیں۔ اِس کی مثال راجپوتانہ اور سِندھ ہے۔ بہر حال ہندُستان کو بحیثیت مجموعی دیکھا

جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت کم زراعتی رقبے جنگلوں سے بمشکل سو میل دور ہیں جہاں سے ایندھن مل سکتا ہے۔ جہاں کثرت سے بارش ہوتی ہے وہاں سرسبز جنگل ہوتے ہیں جن میں پام (palm) فرن (fern) بانس اور ربر کے سدا بہار درخت، سبز پتوں سے لدے ہوئے ہوا میں لہراتے ہیں۔ اونچے پہاڑوں پر صنوبر اور دامن میں اور اُس سے ذرا نیچے، ساگوان، ببول اور اسی قسم کے دوسرے درخت ہوتے ہیں۔

جنگل کا چوبینہ گانو کھیڑوں میں لانے کے لیے، غالباً ہمیں کہیں کہیں ریل اور سڑک بنانے کی ضرورت ہوگی۔ ایک انگریز انجینیر لکھتا ہے کہ اگر پیداوار میں بیس فیصدی کا اضافہ ہو جائے تو تمام ضروری ریلوں اور سڑکوں کی تیاری کے کل اخراجات کی پابجائی ہو سکتی ہے اور پھر بھی بہت کچھ رقم بچ سکتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ زمین میں کھاد دینے کے بعد پیداوار میں بتّیس فیصدی ہی نہیں، بلکہ دو سو سے لے کر تین سو فیصدی کا اضافہ ہوتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم کو جنگل سے اتنا ایندھن مل سکتا ہے جو گوبر کی جگہ استعمال ہو سکے؟ سرسری حساب سے اس کا جواب مل جاتا ہے یعنی کم و بیش فی دیہاتی ایک مویشی ہوتا ہے۔ اس طرح راما اور اُس کے خاندان کے پانچوں افراد کے پاس گویا پانچ مویشی ہوئے۔ ان کا (۵ × ۱½ ٹن) کے حساب سے ۸½ ٹن یا ۲۳۳½ من سالانہ گوبر ہوتا ہے جسے وہ ایندھن کے طور پر

استعمال کرتے ہیں۔ اب اِس کے بدلے لکڑی استعمال کریں تو وُہ صرف ۲ ٹن یا تقریباً ۵۶ من کافی ہوگی۔

ہمارے زراعتی مُلک میں راما کی طرح تقریباً تین کروڑ چالیس لاکھ خاندان ایسے ہیں۔ جنھیں جلانے کے لیے لکڑیوں کی ضرورت ہوگی۔ اِس کے یہ معنی ہوئے کہ ہمیں تقریباً ۶۸۰ لاکھ ٹن لکڑی درکار ہوگی۔ کیا ہمارے جنگلوں سے اِتنا ایندھن نکل سکتا ہے؟ کیوں نہیں، برابر نکل سکتا ہے۔ ابھی ۶۸۰ ٹن تو رہے ایک طرف ہم اپنے جنگلوں میں سے سالانہ دس کروڑ ٹن ایندھن حاصل کر سکتے ہیں اور پھر بھی اُس میں کسی قسم کی کمی نہ ہوگی۔ یعنی تین کروڑ بیس لاکھ ٹن ایندھن بچ جائے گا۔

لیکن اِس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہمارے جنگلوں کا معاملہ اِتنا چوکھا ہے جتنا کہ ہونا چاہیے۔ ہم اپنے جنگلوں سے اُتنا فائدہ نہیں اُٹھا رہے ہیں جتنا کہ ہمیں واقعی اُٹھانا چاہیے۔ گو اِن جنگلوں کی حالت کچھ بُری نہیں ہے مگر پہلے اِس سے زیادہ اچھّی تھی۔ قدیم زمانے میں، ہمارے مُلک کے اکثر حصّوں میں گنجان جنگل تھے۔ مگر اب وہ حالت نہیں رہی۔ ہم نے اپنی بے علمی کی وجہ سے اُنھیں برباد کیا۔ یا تو چوبینہ حاصل کرنے کی غرض سے یا کاشتکاری کرنے کے لیے یا مویشیوں کی چراگاہ بنانے کے لیے اِن جنگلوں کو کاٹ کر ناس کر دیا۔ اُن کی تباہی کے بعد ہماری آنکھیں کُھلیں اور اُن کے فائدوں کا پتا لگا۔

جنگلوں کے تباہ ہو جانے سے پہلی خرابی تو یہ ہوئی کہ زمین

کٹ گئی۔ یہ صُورت تین طریقوں سے پیش آتی ہے۔ پہلے تو دریا کے ساحلوں کی زمین موجوں کے تھپیڑوں سے کٹ کٹ کر پانی کے ساتھ بہتی رہتی ہے اور چند روز میں کناروں کی پوری زمین بہ جاتی ہے۔ دُوسرے موسلا دھار بارش سے اُوپر کی مٹّی بہ جاتی ہے اور چند روز میں دبی ہوئی چٹانیں اَور اُوپر نکل آتی ہیں۔ تیسری صُورت یہ ہے کہ ہوا کے تیز اور سخت جھونکوں سے سطح کی خُشک مٹّی اُڑتی رہتی ہے اور چند روز میں وہ زمین خراب ہو جاتی ہے۔ پانی اور ہوا کے اِس عمل کو کٹاؤ (erosion) کہتے ہیں۔

کوئی چار سو سال پہلے کی بات ہے کہ شمال مغربی ہنُدستان کے جن جنگلوں میں بابر بادشاہ گینڈوں کا شکار کھیلا کرتا تھا آج وہ جنگل ویران پڑے ہیں۔ وہاں درختوں کی جگہ خُشک گھاٹیاں رہ گئی ہیں۔ تصویر میں تُم یہ فرق دیکھوگے۔

زمین کا کٹاؤ بہُت ہی بُرا ہے۔ مثلاً: ممالکِ متحدہ کو دیکھو۔ ہنُدستان کے بڑے دریاے جمنا کی تہ، ممالکِ متحدہ میں گزشتہ پانسو سال کے عرصے میں پچاس فٹ نیچے اُتر گئی۔ بارش کے زمانے میں پہاڑوں پر سے پانی سیلاب کی شکل میں نہایت تیزی سے بہتا ہے اور زمین کو کاٹتا ہُوا نکل جاتا ہے۔ اگر وہاں جنگل ہوتے تو پانی کی قوّت اور سیلاب کے زور کو توڑ دیتے اور پھر اِس طرح مٹّی نہ کٹتی۔

اِسی طرح ضلع اٹاوہ کی زمین ۲۵۰ ایکر فی سال کے حساب سے کٹ کٹ کر بنجر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کی روک تھام



کے لیے وہاں ایک جنگل لگانے کی تجویز کی گئی۔ چنانچہ اُس مقام پر ببول شیشم اور ساگوان وغیرہ کے پودے لگائے گئے جن کے جُھنڈ تین سال کے عرصے میں آدمی کے قد سے دُگنے اور چوگنے دِکھائی دینے لگے۔

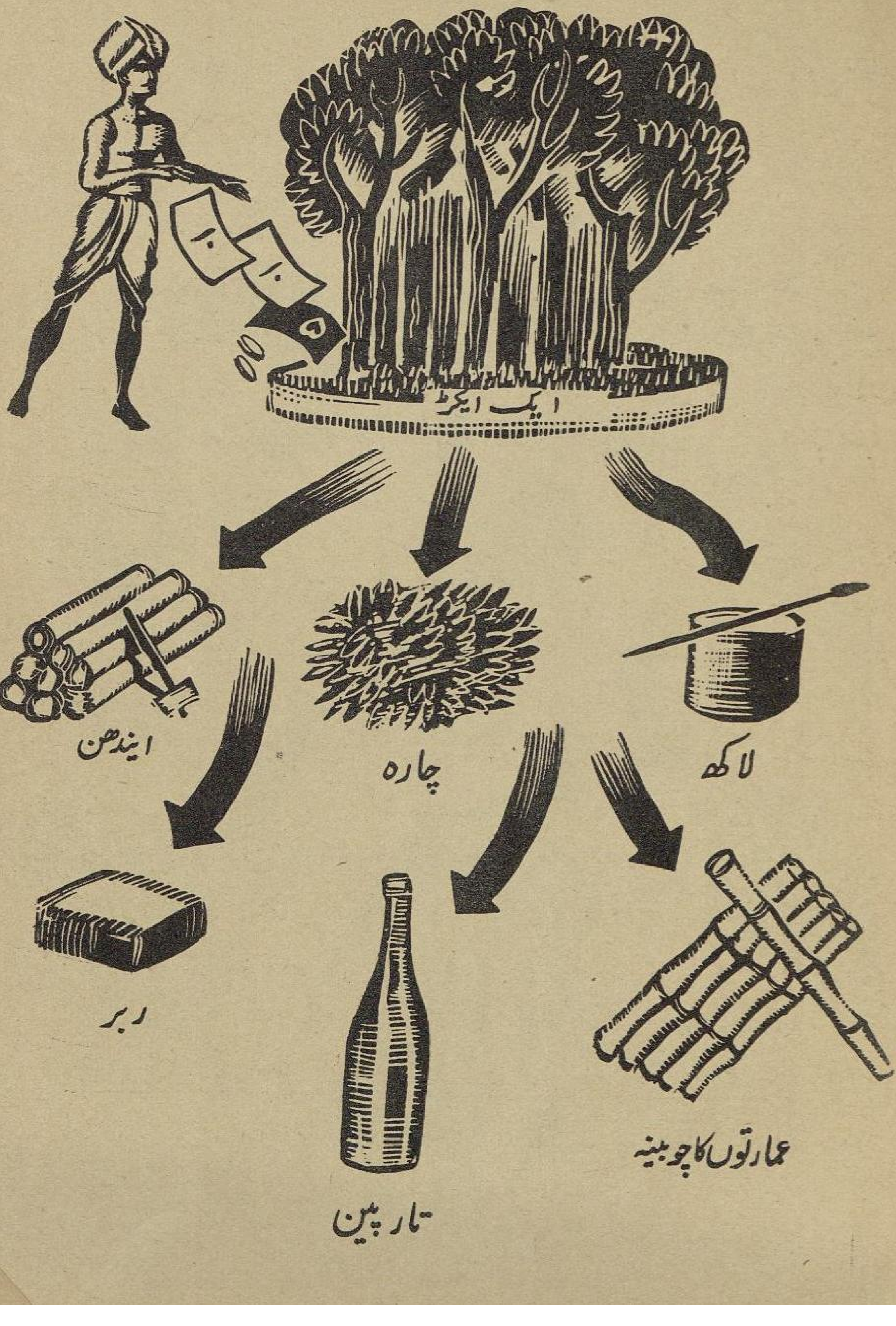
اِس جنگل کی تیّاری میں فی ایکڑ ستّائیس روپے کے قریب لاگت آئی۔ مگر اُس کے فوائد کے مقابلے میں یہ رقم کچھ بھی نہیں ہے۔ اِس سے صرف عمارتوں کے لیے چوبینہ ہی نہیں بلکہ ایندھن کی لکڑی، مویشیوں کا چارا اور مُختلف صنعتوں کے لیے خام اشیا (مثلاً لاکھ، تارپین، بانس، ریسن (resin) ربر اور مُختلف قسم کی دباعنت کا سامان) برآمد ہوتی ہیں۔ پھر یہ جنگل سُورج کی گرمی کو روکتا ہے اور اندرون کو ٹھنڈا کرتا ہے؛ بارش کو بڑھاتا ہے اور سیلاب کی قُوّت توڑتا ہے؛ مٹّی کو بہنے سے روکتا ہے اور زمین کو کٹنے سے محفوظ رکھتا ہے۔

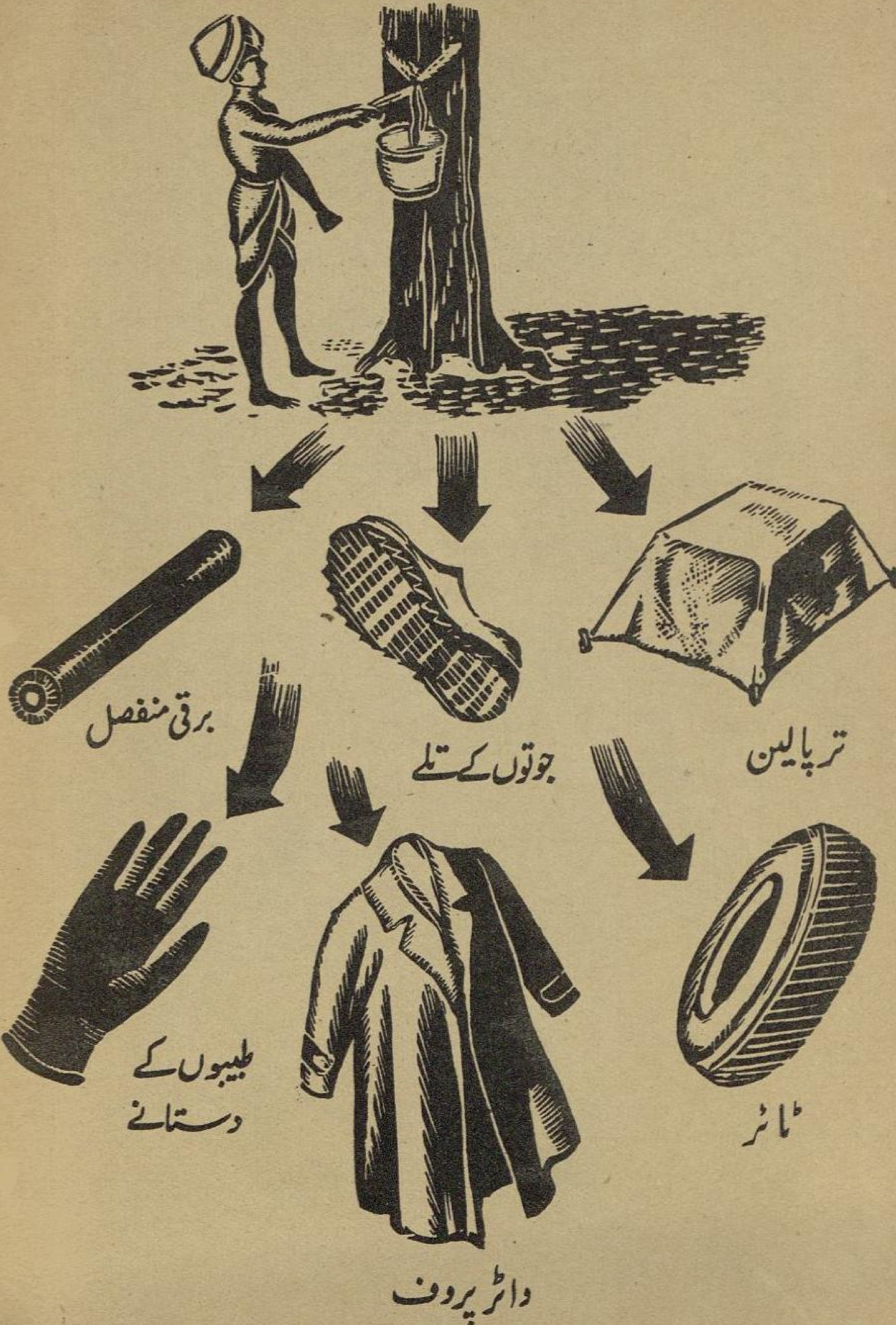
جنگل کی پیداوار کو طرح طرح سے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ ہندُوستان میں وباؤں کی کثرت ہے، اِس لیے علاج مُعالجے کے لیے ہمیں دواؤں کی بڑی ضرُورت ہے۔ ہمارے جنگل، جن میں سیکڑوں قسم کی جڑی بُوٹیاں ہوتی ہیں، دواؤں کے گودام ہیں۔

مثال کے طور پر ربر کو لو، کسی زمانے میں صرف پنسل کے نِشان رگڑنے کے لیے ربر استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ اِسی وجہ سے اُسے ربر[1] کہتے ہیں۔ لیکن آج کل، اگر ربر نہ ہو تو ہر طرف

---

[1] انگریزی میں (rub) بمعنی رگڑنا یا مٹانا۔ (rubber) رگڑنے یا مٹانے والا۔ مترجم

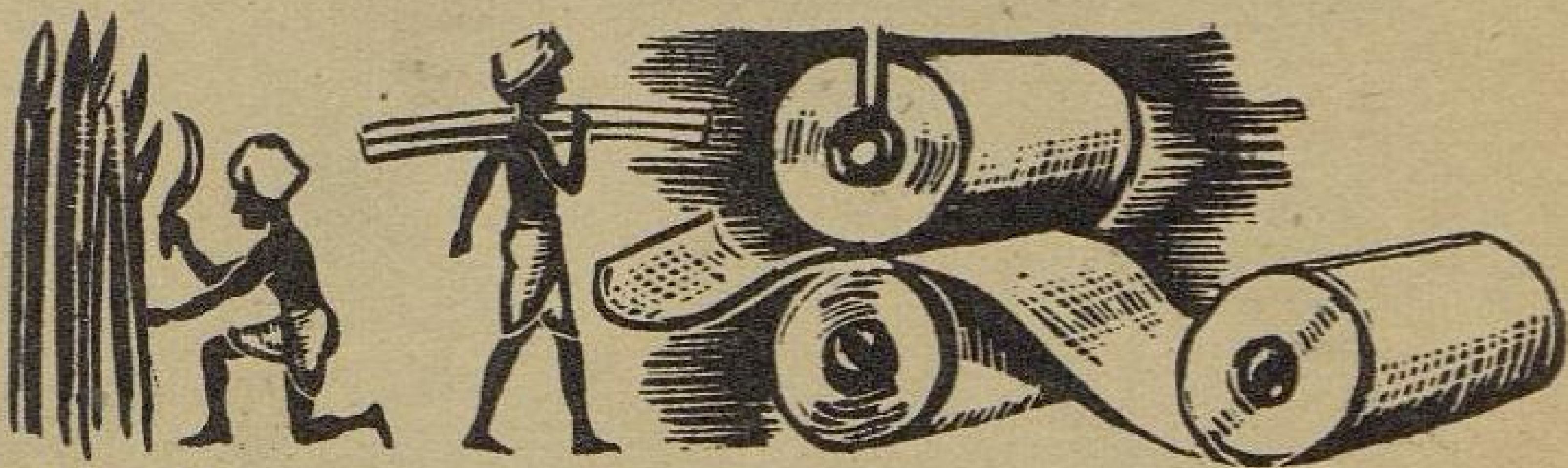

ایک ایکڑ
ایندھن
چارہ
لاکھ
ربر
تارپین
عمارتوں کا چوبینہ



ترپالین
جوتوں کے تلے
برقی منفصل
ٹائر
واٹر پروف
طبیبوں کے دستانے

خاموشی اور اندھیرا ہی اندھیرا ہو جائے! کیوں؟ اِس لیے کہ ربڑ بجلی کے تاروں کو محفوظ کرنے میں کام آتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو بجلی کی روشنی بند ہو جائے اور ٹیلیفون رُک جائے۔

یا کاغذ کو لو جس پر یہ کتاب چھپی ہے۔ بھلا بتاؤ تو کہ یہ کاغذ کہاں سے آیا؟ یہ اُس بانس سے بنایا گیا ہے جو اڑیسہ کے جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔



یہ چھوٹی سی رُوسی نظم پڑھو تو تمھیں پتا چلے گا کہ جنگلوں سے ہمیں کیا کیا چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ یہ نظم ایک ولولہ انگیز کتاب میں ہے جس کا نام "ماسکو کی ایک تجویز" (Moscow Has a Plan) ہے۔ اچھا تو جنگل کا رُوسی گیت پڑھو:

کیسا اچھا جنگل ہے — جنگل میں کیا منگل ہے
ہم نے اُس کا ڈالا پایا — اُس سے ہم نے کیا کیا پایا
تختے اور مستول ملے — اسٹیمر تیار ہوئے
پانی پر جو چلتے ہیں — موجوں سے جو لڑتے ہیں
بعض ہوا میں اُڑتے ہیں — دیو بھی اُن سے ڈرتے ہیں
کتنا اچھا جنگل ہے — جنگل میں کیا منگل ہے
ہم نے ڈالا اُس کا پایا — اُس سے ہم نے پھر کیا پایا

کڑیاں پائیں تختے پائے
شہتیروں کے ٹکڑے پائے
اُن سے پھر گھر بار بنائے
اُونچے اُونچے محل اُٹھائے
بُنیاد پُلوں کی اُن سے ڈالی
دریا پر بھی راہ نِکالی
کُرسی، میز اور الماری
اُن سے بنائیں چیزیں ساری



اگر ہم اپنے جنگلوں کی نگرانی کرتے اور نئے نئے جنگل لگاتے رہتے، تو اِن فائدوں کا خیال کرتے ہوئے ہماری قومی دولت میں کس قدر اضافہ ہوتا۔ اگر ہم اپنے گانْو کھیڑوں کے پاس تھوڑی بہت زمین جنگلوں کے لیے مخصوص کر دیتے اور اچھّی طرح سے اُن کی دیکھ بھال کرتے تو تین چار سال کے عرصے میں ہماری ضرُورت سے زیادہ ایندھن نکلنے لگتا اور پھر ہمیں گوبر جلانے کی مطلق ضرُورت نہ ہوتی۔ ایک عالِم کا خیال ہے کہ اگر کسی گانْو یا کئی گانْووں کی زمین کے تیسویں حصّے پر بھی یُوکلپٹس کے پودے لگا دیے جائیں، تو وہ گانْو والوں کی ضرُورتوں کو آسانی سے پُورا کر سکتے ہیں ٭

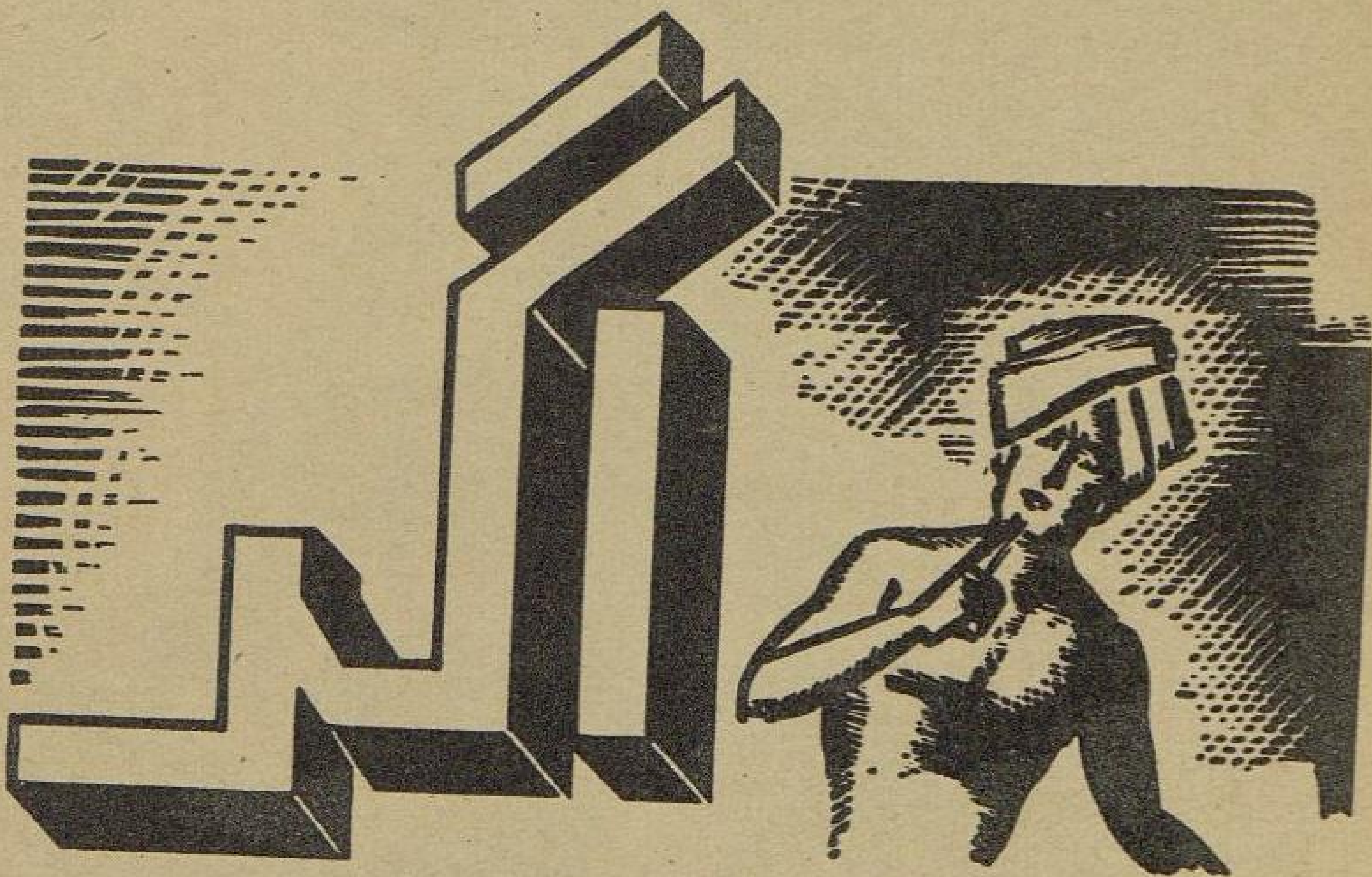
اب ہم نے بہت کافی معلوُمات حاصل کر لی ہیں۔ آؤ، پھر راما کے پاس چلیں اور اُس کی ایندھن کی گُتھّی سُلجھانے میں اُس کی مدد کریں!

سب سے پہلی بات ہم اُس سے یہ کہیں گے کہ تُم اپنے گانْو کے لوگوں کو اِس بات پر راضی کرو کہ وُہ سب اپنی اپنی زمین کے تیسویں حصّے کو محفوظ کر کے، وہاں کارآمد درخت لگائیں۔ اُن درختوں سے اُنھیں جلانے کے لیے لکڑی یا ایندھن ملے گا۔ مگر ایندھن ملنے کے لیے کم سے کم تین سال انتظار کرنا پڑے گا۔

کیا راما اُس وقت تک گوبر جلاتا رہے؟ ہرگز نہیں۔ اُس زمانے میں اُسے رقم کی ضرُورت ہوگی تاکہ وُہ لکڑیاں خرید کر اپنا کام چلائے۔ مگر اُس کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں، وُہ خریدے گا

کہاں سے ؟ اب کسی ایسے شخص کو ڈھونڈنا چاہیے جو اُسے کچھ رقم قرض دے۔ جب گوبر اور کھاد سے پیداوار میں اضافہ ہوگا تو وُہ کاشتکار کوڑی کوڑی ادا کر دے گا۔ میری قطعی رائے ہے کہ حکومت کو یہ کام کرنا چاہیے۔ مگر حکومت کے پاس راما کے ایندھن کے لیے روپیہ کہاں ہے ؟ ہاں اگر راما امدادِ باہمی کی انجمن میں شریک ہو جائے تو پھر شاید اُسے قرض مل جائے۔ خوش قسمتی سے اگر قرض مل گیا تو وُہ اپنی آیندہ فصل کی زیادہ پیداوار سے اُس قرض کو چُکا دے گا۔ اِس کے علاوہ تین سال کے بعد تو گانو والے بقول شخصے جنگل میں منگل منائیں گے۔ اُن کے درخت بڑھ جائیں گے اور اُنھیں ضرورت سے زیادہ ایندھن ملنے لگے گا۔

کیا اِس کے بعد بھی وُہ خُوش حال نہ ہوں گے ؟ ضرور۔ مگر بات یہ ہے کہ اُس میں چند "اگر مگر" بھی ہیں۔ یعنی "اگر" اُس کے ساتھی یا گانو کے رہنے والوں میں اِتنی عقل ہے کہ وُہ اِس نئے جنگل کے لیے اپنی زمین کا تیسواں حصّہ دینے کے لیے راضی ہو جائیں ! "اگر" کوئی ایسا خدا کا بندہ مل جائے جو اُسے کچھ رقم قرض دے دے اور سب سے بڑی ایک "اگر" یہ کہ اللہ اپنی مہربانی سے خوب مینہ برسائے تو سرسبز ہوگئے ورنہ فصل مٹی میں مل جائے گی اور کی کرائی محنت اکارت جائے گی۔ اب تُم خود سوچو کہ بھلا ایسی زمین میں کھاد دینے سے کیا فائدہ جو بارش نہ ہونے کی صُورت میں کچھ بھی پیدا نہ کر سکے ؟ اِن حالات میں "اگر مگر" کے ہاتھوں راما کے لیے، ہمارے تمام منصُوبے شیخ چلی کے منصُوبوں کی طرح خاک میں مِل جاتے ہیں۔ اگر ـــــ مگر ـــــ





چھٹا باب

چند اگر مگر......

میرے مولا پانی دے   میرے داتا پانی دے
دھرتی سوکھی کھیت پیاسے   خشک پڑے ہیں ندی نالے
میرے مولا پانی دے   میرے داتا پانی دے
گھر گھر کر وہ بادل آئے   ڈھیروں پانی بھر کر لائے
بھورے بھورے کالے کالے   ہلکے جیسے روئی کے گالے
آؤ آؤ ، جم جم آؤ   چھم چھم ، چھم چھم مینہ برساؤ
میرے مولا پانی دے
میرے داتا پانی دے

کیا تمھیں یہ گیت پسند نہیں آیا؟ اسے گانو کی لڑکیاں گایا کرتی ہیں۔ یہ بنگال کے ایک مشہور شاعر، جسیم الدّین کا لکھا ہُوا ہے۔ یہ ایک دیہاتی لڑکے اور لڑکی کی محبّت کا گیت ہے جسے سُن کر گانو کے لوگوں کی سیدھی سادی زندگی کی ایک زندہ اور دلکش تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ بارش کی فکر میں کتنے ڈوبے رہتے ہیں۔ بعض اوقات جب بارش نہیں ہوتی تو تمام بڑے بوڑھے ، مرد و عورت اور لڑکے لڑکیاں ایک جگہ

جمع ہوکر گڑگڑا گڑگڑا کر اور بلبلا بلبلا کر برسات کے لیے اِس طرح دُعائیں مانگتی ہیں :

میرے مولا پانی دے میرے داتا پانی دے
پانی دے ، پانی دے پانی دے ، پانی دے

بارش کا اِنتظار ہندُستان کی ایک خصوصیّت ہے ۔ ہم اِس کے پنجے میں کچھ اِس طرح گرفتار ہیں کہ دُوسرے مُلکوں کے لوگ اِس کا اندازہ مطلق نہیں کر سکتے ۔ ذرا کسان کے دِل سے پُوچھو کہ بارش کیا چیز ہے ؟

اِسی وجہ سے ہم نے ابتدا ہی میں کہہ دِیا ہے کہ اگر بارِش اچھّی ہو تو کھاد سے پیداوار میں "تین گُنا" اضافہ ہو جاتا ہے ۔ تُم نے دیکھ لِیا کہ زمین کو سیراب کرنے کے لیے مان سُون کِس قدر ضروری ہے ۔ اگر یہ نہ ہو تو آدمی پیاسے مر جائیں اور فصل مٹّی میں مِل جائے ۔ مان سُون کے دو نتیجے ہوتے ہیں : ایک تو بارِش جو ہمارے مُلک کے ہر حصے میں ہوتی ہے اور دُوسرے دریا اور ندّیاں جو پہاڑوں سے نِکل کر بہتی ہیں ؂

مان سُون کا پہلا کام بہت زیادہ اہم ہے ، اِس لیے کہ صرف ندّیوں اور دریاؤں میں اِتنا پانی نہیں ہوتا کہ وُہ ہمارے مُلک کی "پُوری زمین" کو سیراب کر سکیں ۔ پہلے تو اِس بڑے مُلک میں دریا گِنتی کے ہیں ، بعض حصّوں میں تو سِرے سے ہیں ہی نہیں ۔ بُہت سے ایسے حصّے ہیں جہاں کھیتی کا دار و مدا ۔ بالکل بارِش پر ہے ۔ بدقسمتی سے بُہت سے ایسے مقام بھی ہیں جہاں مُشکل ہی سے

کچھ بارش ہوتی ہے ؛ جیسے کہ بالائی سندھ وغیرہ ؛

مان سُون کی ایک خرابی یہ ہے کہ جہاں برستا ہے وہاں بھی اُس میں کوئی باقاعدگی نہیں ہوتی۔ یہ ناقابلِ بھروسہ ہوتا ہے اور بعض وقت سخت دھوکا دیتا ہے۔ یہ ایک مکّار اور چڑچڑے دیو کے مانند ہے۔ گھڑی میں تولہ تو گھڑی میں ماشہ، ابھی خوش ہے تو ابھی خفا! کسی[1] سال کہیں مُوسلا دھار برستا ہے تو کسی سال وہاں ایک قطرہ بھی نہیں گرتا! ایک سال گجرات میں زیادہ برستا ہے اور صوبۂ متوسط میں کم، تو دُوسرے سال صوبۂ متوسّط میں زیادہ برستا ہے اور گجُرات میں کم! ایک سال بارش جلد شروع ہوتی ہے اور جلد ختم ہو جاتی ہے، تو دُوسرے سال دیر سے شروع ہوتی ہے اور دیر تک ہوتی رہتی ہے! اور تو اور خود گورنمنٹ کے ماہرین اِس کے چکّر میں رہتے ہیں اور یہ پیشین گوئی نہیں کر سکتے کہ مان سُون کا کِس زمانے میں کیا حال رہے گا۔ کسان بے چارے دیدے پھاڑے ہُوئے آسمان کو گھُورتے رہتے ہیں اور بڑی بے چینی سے بارش کی راہ تکتے رہتے ہیں۔ انھیں لاچار ہر سال یہی جُوا کھیلنا پڑتا ہے۔ غرض کہ ہار جیت مان سُون پر ہے۔ جیتے تو پو بارے اور ہارے تو لنگوٹی بھی ہارے۔ پھر اچھّی بارش ہونے کے باوجود بعض فصلوں مثلاً: گنّے یا دھان کو

---

[1] حضرت غالبؔ نے ہندُستان میں قحط کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ اَن کال یعنی بارش نہ ہونے سے کال پڑے اور پن کال، یعنی زیادہ پانی برسنے سے قحط پڑے کھیت برباد ہو جائیں اور دونوں صُورتوں میں لوگ بھوکوں مریں ؛ مترجم



عُمدہ زمین کے علاوہ "کثرت" اور "بڑی باقاعدگی" سے پانی دینے کی ضرُورت ہوتی ہے۔ یہی حال جاڑے کی فصلوں کا ہے جن کو ہمیشہ زیادہ پانی کی ضرورت پڑتی ہے۔

کیا ہمارے کسان ہمیشہ اِن قُدرتی عناصر کے رحم و کرم پر رہیں؟ کیا وُہ ہمیشہ اِن مُصیبتوں[1] کا شکار ہوتے رہیں؟ کیا اُن کو اِس غیر اطمینانی حالت اور اِن مُصیبتوں کے پنجے سے چھُڑانے کی کوئی تدبیر کی جا سکتی ہے یا نہیں۔

کیوں نہیں، بہُت سی تدبیریں کی گئیں اور بہُت کچھ کرنی باقی ہیں۔ جہاں جہاں کھیتوں کے قریب سے دریا گزر رہے ہیں وہاں لوگ دریا سے پانی لے کر اپنی زمینیں سیراب کر سکتے ہیں۔ مگر یہ طریقہ چھوٹے چھوٹے رقبوں کے لیے مُفید اور کارآمد ہے۔ بڑے رقبوں میں پانی پہُنچانے کے لیے نہروں کی ضرُورت ہے۔ اِن نہروں کو دریا سے پانی لے کر ایسے مقامات پر پہُنچا سکتے ہیں جہاں پانی کی کمی ہے۔ اِس طریقے سے پانی پہُنچانے کو آبپاشی (irrigation) کہتے ہیں۔

بڑے تالاب تعمیر کرنے کا طریقہ اور کنُوئیں کھود کر زمین کی تہ سے پانی حاصل کرنے کا دستوُر ہمارے ہاں قدیم سے چلا آتا ہے۔ گزشتہ سَو سال سے نہروں کے ذریعے آبپاشی کا کام بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے اور اُن سے کھیتی باڑی کرنے والے بے حد

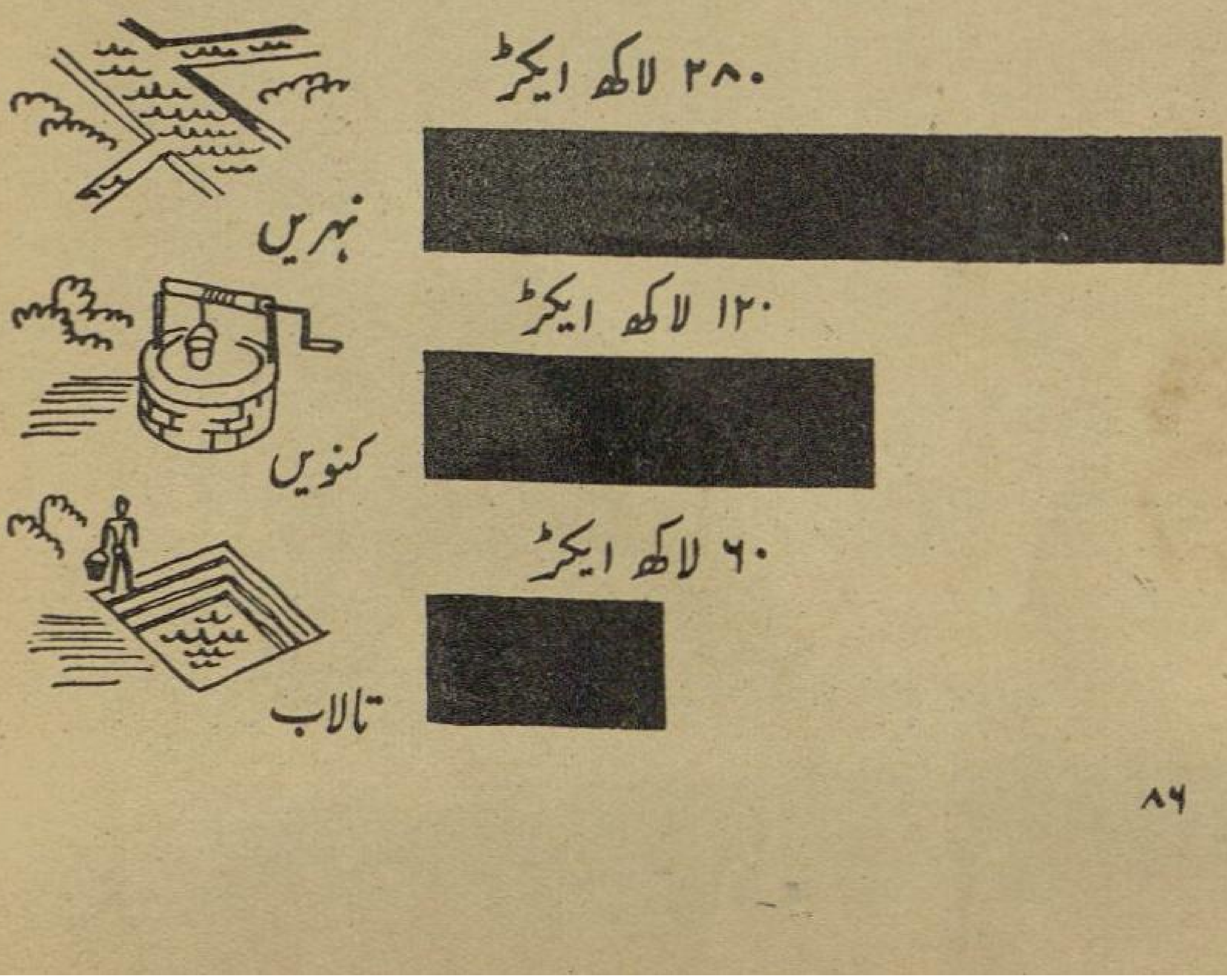
---

[1] حضرتِ غالب نے کسانوں کے حالِ زار کی کیا خوُب تصویر کھینچی ہے: ابر بے باراں ہے، چاہ بے آب ہے، عمل بے مشورہ ہے، خانہ بے چراغ ہے اور چراغ بے نور ہے۔ مترجم

فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ آج ہماری مزروعہ زمین کا "پانچواں" حصّہ اِنھیں نہروں سے سینچا جا رہا ہے ؂

کنوؤں کے ذریعے سے کھیتوں میں پانی دینے کا طریقہ سب سے زیادہ قدیم، سب سے زیادہ قابلِ بھروسہ اور سب سے زیادہ مُفید ہے۔ آج ہندُستان میں تقریباً ایک کروڑ بتّیس لاکھ کنوّیں ہیں اور اُن کے ذریعے کم و بیش ہندُستان کے یک چوتھائی رقبے کی آبپاشی کی جا رہی ہے ؂

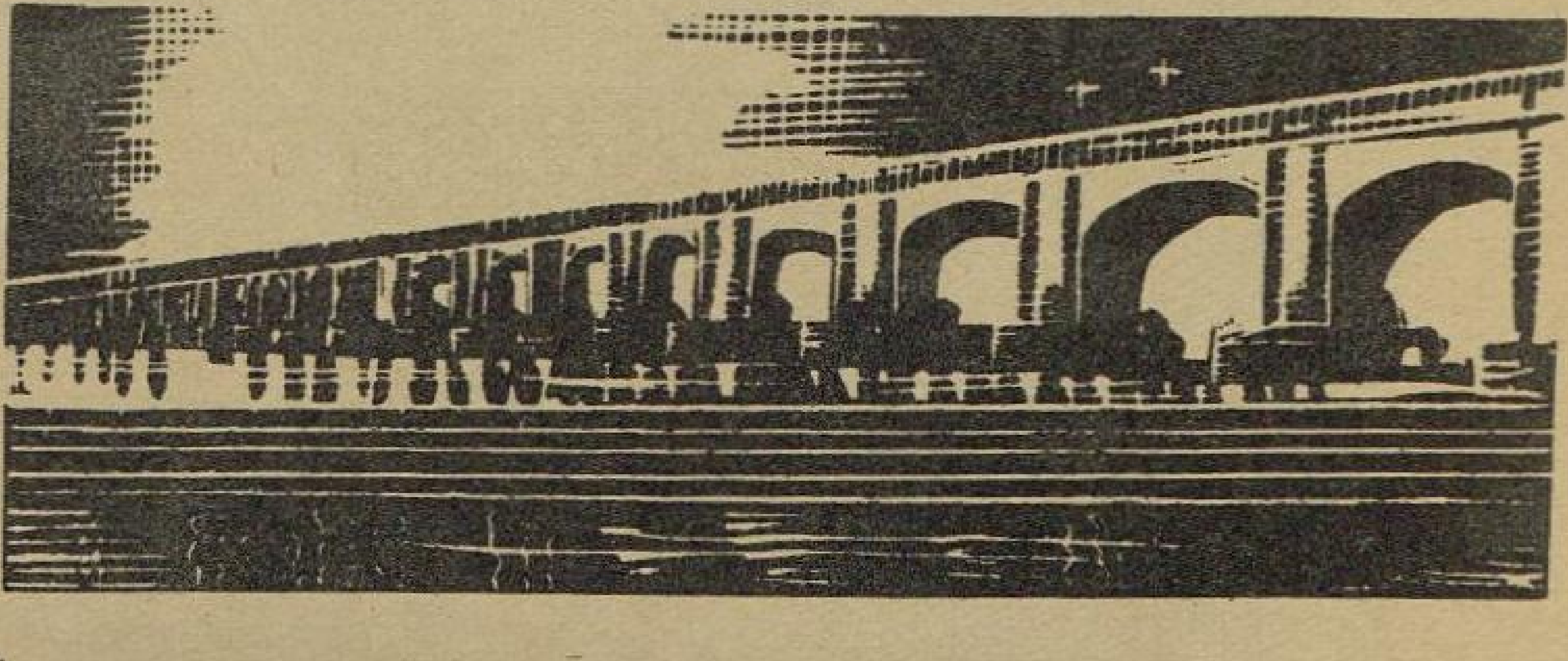
تالابوں سے آبپاشی کرنے کا طریقہ بہُت پُرانا ہے۔ مدراس کے لوگ اِس سے خوب واقف ہیں اور وہاں کوئی چالیس ہزار کے قریب تالاب ہیں۔ مگر پنجاب اور سندھ میں کوئی اُن کا نام بھی نہیں جانتا۔ بات یہ ہے کہ وہاں صرف تین یا چار اِنچ بارِش ہوتی ہے اور جہاں بارِش کی یہ کیفیت ہو وہاں تالاب کیسے



بنائے جا سکتے ہیں ؟

نہروں کے ذریعے آبپاشی کرنے کا طریقہ نہایت اہم اور مُفید ثابت ہُوا ہے ۔ ہمارے ہاں کافی نہریں ہیں ۔ اگر ان تمام نہروں کی لمبائی کو جوڑا جائے تو کوئی سترّ ہزار میل کے قریب ہوتی ہے ۱۹۳۶ء-۳۷ء میں کُل پانچ کروڑ بیس لاکھ ایکڑ زمین کی آبپاشی کی گئی : جس میں سے دو کروڑ ، اسّی لاکھ ایکڑ زمین پر نہروں کے ذریعے سے آبپاشی کی گئی ، ساٹھ لاکھ ایکڑ زمین پر تالابوں کے ذریعے سے آبپاشی کی گئی ، ایک کروڑ بیس لاکھ ایکڑ زمین پر کنوؤں کے ذریعے سے آبپاشی کی گئی اور ساٹھ لاکھ ایکڑ زمین پر دُوسرے طریقوں سے آبپاشی کی گئی تھی ۔

نہریں بنانے کے دو طریقے ہیں : ایک طریقہ تو یہ ہے کہ دریا کاٹ کر پانی لیا جائے ۔ یہ طریقہ عام طور پر شمالی ہند اور مدراس میں رائج ہے ۔ دُوسرا طریقہ یہ ہے کہ وادی میں ایک بند (dam) باندھا جائے تاکہ بارش کا پانی اُس میں جمع ہو ۔ مگر اِس کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مقام پہاڑی ہو اور دُوسری یہ کہ وہاں



بارش اچھی ہوتی ہو؛ جیسے کہ بمبئی یا صوبجات متوسط ہیں۔ اِس کے علاوہ دریا یا ندی پر بھی براز یا بند (dam or barrage) باندھ کر پانی روک دیتے ہیں؛ جس طرح سندھ میں دریائے سندھ پر "سکھر براز" (Sukkur Barrage) یا ریاست حیدر آباد میں دریائے مانجرا کو روک کر نظام ساگر بنایا گیا ہے۔

آبپاشی سے پیداوار اور آمدنی میں بہت کچھ اضافہ ہوتا ہے اور کسان آہستہ آہستہ حکومت کو ٹیکس ادا کرکے آبپاشی کے کاموں کی لاگت کی پابجائی کرتے رہتے ہیں۔ بعض تالاب زراعت کی ترقی کے لیے ہی نہیں بلکہ قحط کی بلا سے نجات دلانے کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔ یہ عام طور پر ایسے مقام پر بنائے جاتے ہیں، جہاں بارش کم ہوتی ہے؛ جیسے کہ دکن ہے۔ پہلی قسم کے آبپاشی کے کاموں کو "منفعتی" (productive) اور دوسری قسم کو "حفاظتی" (pro-tective) کہتے ہیں۔

آبپاشی کے کاموں سے ابھی ہمارے مُلک کے تمام حصّوں کو مساوی طور پر فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔ سندھ خوش قسمت ہے کہ وہاں ۷۷،۳ فی صدی مزروعہ زمین کے رقبے میں نہروں سے آبپاشی کی جاتی ہے۔ مگر پنجاب میں ۴۴،۱۔ بنگال میں ۶،۲ فیصدی، صوبۂ متوسط اور برار میں ۴،۲ فی صدی اور بمبئی میں سب سے کم؛ یعنی ۹،۳ فی صدی رقبہ سیراب ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ سندھ میں بہ نسبت بمبئی کے آبپاشی کی زیادہ ضرورت ہے۔ تب بھی ہمیں کتنے اور تالابوں، کنوؤں اور نہروں کی ضرورت ہے! زیادہ سے زیادہ

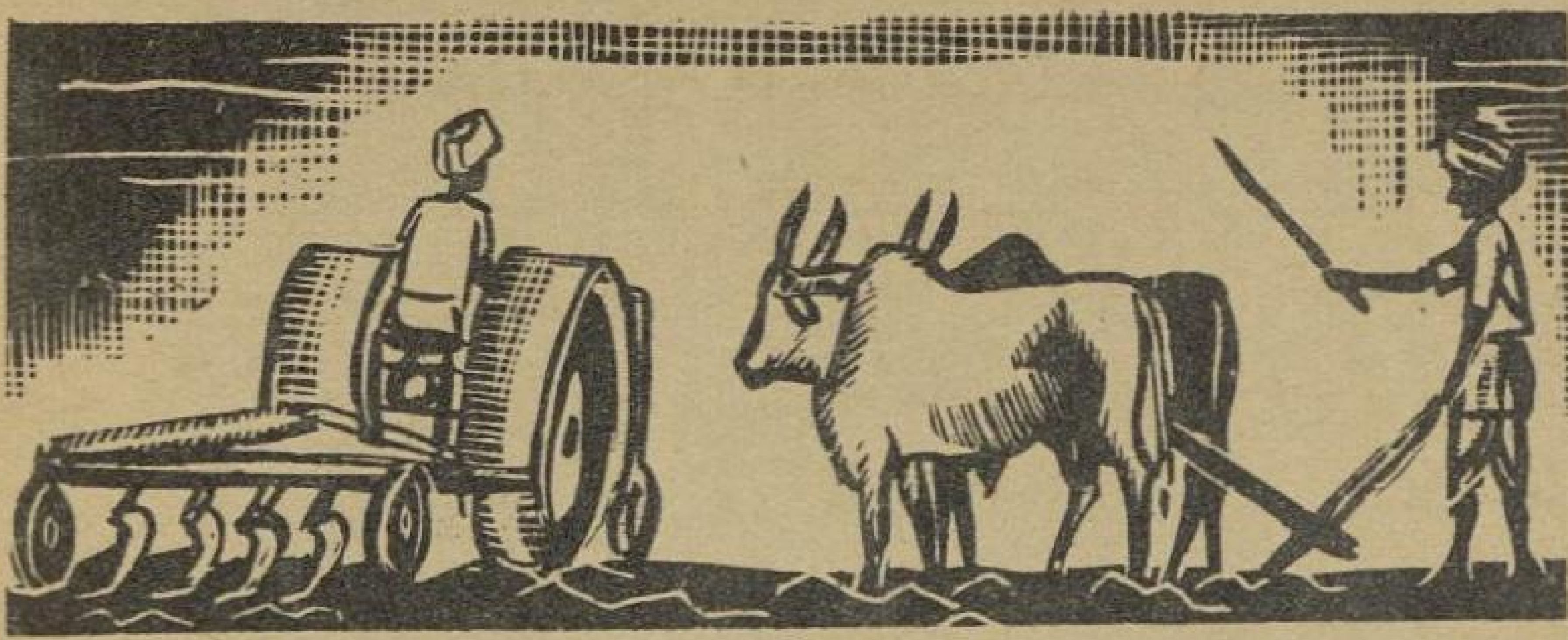
نہریں، دریاؤں کو کاٹ کر اور بارش کا پانی وادیوں میں جمع کر کے نکالی جائیں "تاکہ ہماری "پوری" زمین پر کسی ایک نہ ایک طریقے سے آبپاشی ہونے لگے۔ کنوئیں کھود کر بھی اِن میں پمپ لگائے جائیں۔ اگر کھیت اِتنا چھوٹا ہے کہ ایک آدمی اُس کا صرفہ برداشت نہیں کر سکتا تو چند آدمی مل کر اُس کا اِنتظام کریں، اور سب اخراجات کا بار اُٹھائیں۔

اب اگر کھیتوں میں اچھّی طرح سے کھاد بھی دِیا گیا اور پانی بھی خوب دِیا گیا مگر تخم (بیج) اچھا نہیں استعمال کیا گیا، زمین اچھّی طرح سے نہیں جوتی گئی، پوری طرح سے نگرانی نہیں کی گئی، فصل قرینے سے نہیں کاٹی گئی اور غلّہ حفاظت سے ذخیرہ نہیں کیا گیا، تو پھر بھی زیادہ فائدے کی اُمّید نہیں رکھنی چاہیے۔

آج سے سو برس پہلے تک دُنیا میں کھیتی باڑی کا کام انسان اپنے ہاتھوں اور اپنے مویشی کی مدد سے انجام دیتا تھا۔

جب اِنسان نے کارخانوں میں دُخانی یا "بھاپ اِنجن" چلتے دیکھے تو اُسے خیال ہُوا کہ کھیتی باڑی میں بھی مویشی کے بدلے بھاپ کی قوّت سے کیوں نہ کام لیا جائے؟ اُس نے سوچا کہ مشین سے کام بھی بہت جلد ہوتا ہے اور اخراجات بھی بہت کم بیٹھتے ہیں۔ بس پھر کیا تھا، ہر قسم کی مشینیں ایجاد ہو گئیں اور یورپ کے مُلکوں میں ہل جوتنے، فصل کاٹنے، غلّہ ذخیرہ کرنے اور بھوسہ پھٹکنے کی مشینیں استعمال ہونے لگیں اور پمپ سے پانی دیا جانے لگا۔

ابتدا میں تو یہ مشینیں بھاپ سے چلتی تھیں، پھر تیل استعمال



ہونے لگا اور آج کل تو بجلی کی قوّت سے چلائی جاتی ہیں۔ موٹر ٹریکٹر سے ایک دِن میں پانچ ایکڑ زمین جوت لی جاتی ہے جہاں بیلوں سے صرف ایک ایکڑ مُشکل سے جوتی جاتی تھی۔ امریکہ میں، گائے کا دُودھ گوآل[1] نہیں دُہتا بلکہ برقی مشینوں کے ذریعے نِکالا جاتا ہے۔ جس میں ہاتھ تو رہا ایک طرف اُنگلی بھی نہیں لگانی پڑتی۔ گویا "یہ سامان بالکل اچھوتا ہوتا ہے"۔ اِس لیے نہایت صاف، سُتھرا اور بے ضرر۔ سویڈن میں اب یہ تجربہ کیا جا رہا ہے کہ اگر زمین کے نیچے بجلی کے تار بچھا دیے جائیں تو فصل کتنی جلد تیار ہو سکتی ہے!

کیا ہمارے مُلک میں بھی زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کے لیے اِن برقی مشینوں اور سائنس کی ایجادوں سے کوئی کام لیا جا رہا ہے؟ افسوس، بالکل نہیں! ہمارے مُلک میں تو بہت کم لوگ ایسے ہیں جو لوہے کا ہل استعمال کرتے ہیں۔ وُہ تو وہی دقیانوسی

---

[1] گائے بھینس رکھنے والے اور چرانے والے کو گوآل، گوالا یا گھوسی کہتے ہیں۔
مترجم

لکڑی کے ہل اور اوزار استعمال کرتے ہیں اور وُہی قدیم زمانے کے طریقوں پر چلتے ہیں جو آج سے ہزاروں سال پہلے رائج تھے۔ اِس کی کیا وجہ ہے؟ بات یہ ہے کہ پہلے تو ہمارے لوگ بے حد غریب ہیں اور مشینیں مہنگی ہیں۔ دُوسرے ہمارے مُلک کے دس کروڑ مزدُور جن کی ذرا سی بھی ذاتی زمین نہیں ہے بہت تھوڑی مزدوری پر مل جاتے ہیں۔ اب جہاں مزدُور کوڑیوں کے مول ملیں پھر وہاں مشینیں کِس طرح چل سکیں؟ ایک سبب اور بھی ہے اور وُہ ہمارے کِسانوں کی جہالت ہے۔ دُنیا کے دُوسرے لوگوں نے سائنس کو زراعت کی خدمت پر لگایا ہے مگر ہمارے کِسانوں کی تو یہ کیفیت ہے کہ اُن میں سے بہُت سے تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ٹریکٹر کِس چڑیا کا نام ہے! اُنھیں تو بیج کے بُرے بھلے ہونے کا بھی علم نہیں۔ وہ تو وہی دقیانوسی آلات استعمال کر رہے ہیں اور اپنا غلّہ وغیرہ اِس بے دردی اور لاپروائی سے ذخیرہ کرتے ہیں کہ اُس کا بہُت کچھ حِصّہ برباد ہو جاتا ہے۔

ہمیں دیہاتیوں کو تعلیم دینے کی سخت ضرُورت ہے۔ صرف لِکھنا پڑھنا ہی سِکھانا کافی نہیں بلکہ خود اُن کو اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دینا بھی سِکھانا ہے۔ اگرچہ حکومت کی جانب سے محکمۂ زراعت کے بعض عہدے دار اِس کام کے لیے مقرّر ہیں جو عام طور پر دورے کرتے ہیں اور کِسانوں کو ہدایتیں دیتے رہتے ہیں مگر اُن کی تعداد اِس قدر کم ہے کہ پنجاب میں اُن میں سے ہر ایک آدمی کو نو نو ہزار کھیتوں کا معائنہ کرنا پڑتا ہے! اِس

حساب سے اگر وُہ ہمیشہ دورہ کرتے رہیں تو جس کھیت کا آج معائنہ کیا ہے پھر اُس کے معائنے کی باری کئی سال کے بعد آئے گی۔ مگر یہاں تو ضرُورت اِس بات کی ہے کہ روزانہ کِسانوں سے میل جول رکھّا جائے، مشینوں سے واقفیت پیدا کرنے کے لیے اور اُن سے کام لینے کے طریقے سکھانے کے لیے انجینروں کو گانْو گانْو پھرایا جائے اور یہ مشینیں اُن کے ہاتھ نہایت سستے داموں میں پہنچ جائیں۔ اِس کے یہ معنی ہیں کہ ہندُستان میں بڑے بڑے کارخانے قائم کیے جائیں جہاں یہ مشینیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں بنیں اور وہاں سے پھر ریل کے ذریعے کرائے میں تخفیف کرکے ہر ایک گانْو تک پہنچائی جائیں۔

دُوسری چیز ہمارے کِسانوں کو یہ سِکھانی چاہیے کہ وہ سُدھارے ہوئے بیج بوئیں۔ امریکہ میں سائنس کی مدد سے بیجوں کو سُدھار کر چاول کی فصل ایک ہزار پونڈ فی ایکڑ سے دو ہزار پونڈ فی ایکڑ پہنچا دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ افغانستان میں بھی اِس سال، سالِ نو کا جشن عُمدہ بیج بونے سے منایا گیا جو حکومت نے کِسانوں کو تقسیم کیے تھے۔

دُوسری ضروری چیزوں کے علاوہ کِسانوں کے لیے کاشتکاری کے واسطے مویشی بہُت ضرُوری ہیں۔ اُس کے پاس عام طور پر بیلوں کی ایک جوڑی اور ایک گائے ہوتی ہے مگر یہ بات ہر جگہ نصیب نہیں۔ چند سال ہوئے کہ مہاتما گاندھی اوڑیسہ کے دیہات کا دورہ کر رہے تھے جو ہمارے مُلک کے غریب ترین حصّوں

میں شمار ہوتے ہیں۔ خوش قسمتی سے میں بھی اُن کے ساتھ تھا۔ مجھے اچھّی طرح یاد ہے کہ ہم بعض ایسے دیہات میں سے گزرے جہاں گائے نام کو بھی نہ تھی۔ وہاں کے بچّوں کی حالت دیکھ کر میرا دِل بھر آیا اور میں سوچنے لگا کہ ہائے افسوس! اِن معصوم بچّوں کی قسمت میں دُودھ کا ایک گھونٹ بھی نہیں!

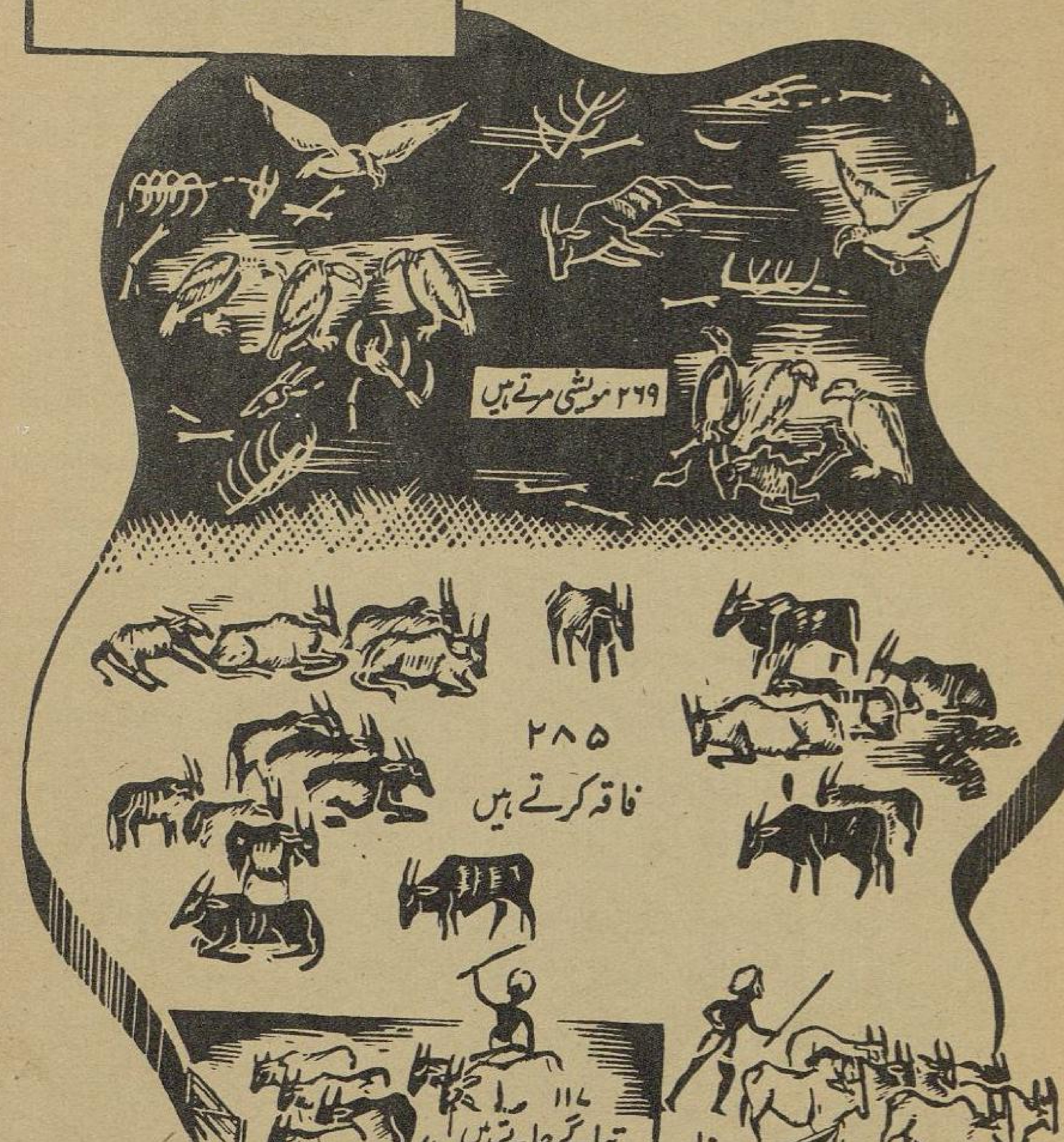
سچ پُوچھو تو کِسان کے لیے خود اُس کے مویشی زمین کے بعد ایک بڑی دولت ہوتے ہیں۔ تُم جانتے ہو کہ مویشی اُس کے کِس قدر کام آتے ہیں؛ کھیتوں میں ہل جوتتے وقت جُوا کاندھوں پر رکھے پُورے کھیت میں چکّر لگاتے ہیں، چھکڑا کھینچتے ہیں، کبھی گانو سے بازار اور کبھی بازار سے گانو میں سامان لاد کر لاتے اور لے جاتے ہیں۔ گائے سے بچھڑے پیدا ہوتے ہیں جن کی اُنھیں اچھّی قیمت مِل جاتی ہے۔ گائے دُودھ دیتی ہے جسے کِسان کے بال بچّے پیتے ہیں۔ اِس کے عِلاوہ کسی کا قول ہے: "اِس ترکاری کھانے والے مُلک میں اگر اچھّا دُودھ، گھی اور مسکہ بھی نہ مِلا تو پھر اور کیا خاک ملے گا؟" دُوسری بات یہ ہے کہ اِن مویشی کی ہر چیز کار آمد ہے۔ اِن کی کھال، دانت، ہڈیاں، سینگ اور کُھر وغیرہ مُختلف طرح سے کام آتے ہیں۔ پھر کہیں تم گوبر کو نہ بھُول جانا، جو پچاس طریقوں سے کام آتا ہے۔ یہی سب خُوبیاں تو ہیں جن کی وجہ سے کِسان مویشی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے اور وُہ اور اُس کے بال بچّے سب مویشی کے ساتھ ایک ہی کوٹھے میں سوتے ہیں!



اگرچہ ہم اپنے مویشی کو حفاظت سے اپنے پاس رکھتے ہیں مگر افسوس! ہم اُن کو موٹا تازہ رکھنے کی فکر نہیں کرتے۔ نہ تو ہم نے اُن کے لیے زمین کا کوئی رقبہ مخصوص کیا کہ جہاں چارا پیدا ہو اور نہ کوئی چراگاہ بنائی ہے جہاں جاکر وہ اپنا پیٹ بھر سکیں۔ بارش کے زمانے میں جب گھاس پیدا ہوتی ہے اُس وقت اُنھیں غذا ملتی ہے اور وہ خوب جی بھر کر کھاتے ہیں۔ بعض اوقات تو وہ گھاس پر کنگالوں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں اور اس قدر کھا جاتے ہیں کہ اُنھیں بدہضمی ہو جاتی ہے! دسمبر میں تھوڑی بہت گھاس رہتی ہے پھر دسمبر سے جون تک دن بدن اُن کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ گردن ڈالے، خشک اور بنجر زمین پر چکّر مارتے رہتے ہیں۔ مگر گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں ملتا۔ اُن کی ہڈّیاں نکل آتی ہیں اور وہ سوکھ کر کانٹا ہو جاتے ہیں۔ پھر جہاں قحط ہو، وہاں تو اُن کی اور بھی بُری گت بن جاتی ہے۔ چنانچہ میں نے ایک صبح اخبار میں پڑھا :-

"کراچی کے مارکٹنگ افسر نے ضلع تھرپارکر کے قحط کی کیفیت لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ چھے لاکھ اکیّاسی ہزار مویشی میں سے دو لاکھ اُنتّر ہزار مویشی مرگئے؛ گیارہ لاکھ سات ہزار ضلع کے باہر مُنتقل کر دیے گئے؛ دس ہزار

۶۸۱ مویشی میں سے



تین روپے سے لے کر دس روپے فی مویشی کے حساب سے فروخت کر دیے گئے اور بقیّہ دو لاکھ پچّاسی ہزار میں سے بہت زیادہ مویشی چارا نہ ہونے سے فاقے مر رہے ہیں"۔

یہاں تو یہ کیفیت ہے کہ آدمیوں کے مقابلے میں مویشی کے لیے چارا فراہم کرنے کی اور بھی کم فِکر کی جاتی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو زیادہ گھاس اُگانا کیا مُشکل ہے! اگر ہم نے یہ کِیا تو تھوڑی مُدّت میں ہمارے ہاں اِتنا چارا پیدا ہو جائے گا جو ہمارے "تمام مویشی کے لیے تو نہیں" مگر "جِتنے مویشی کی واقعی ہمیں ضرورت" ہے اُن کے لیے بُہت کافی ہوگا۔

لوگوں کا خیال ہے کہ دُنیا میں کُل مویشی کی تعداد ۴۵ کروڑ کے قریب ہے اور اُن میں سے ہمارے مُلک میں ۱۵ کروڑ ہیں۔ اِس سے یہ مطلب ہے کہ گویا دُنیا بھر کے مویشی کی تعداد کے مقابلے میں ہمارے مُلک میں ایک تہائی مویشی ہیں۔ یہ تعداد بُہت زیادہ ہے۔ مصر میں ہر سو ایکڑ مزروعہ زمین پر پچیس مویشی ہیں۔ ڈچ جو مویشی پر جان دیتے ہیں اور جو مسکہ اور پنیر تیّار کرتے رہتے ہیں اُن کے پاس اِسی رقبے میں ۳۸ مویشی ہوتے ہیں۔ مگر ہمارے مُلک میں اِسی رقبے میں ۶۷ مویشی ہیں! ہمارے مُلک کی طرح وہاں بھی مویشی کی کثرت ہے! اب ہمارے ہاں چارے کی کمی ہو تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔

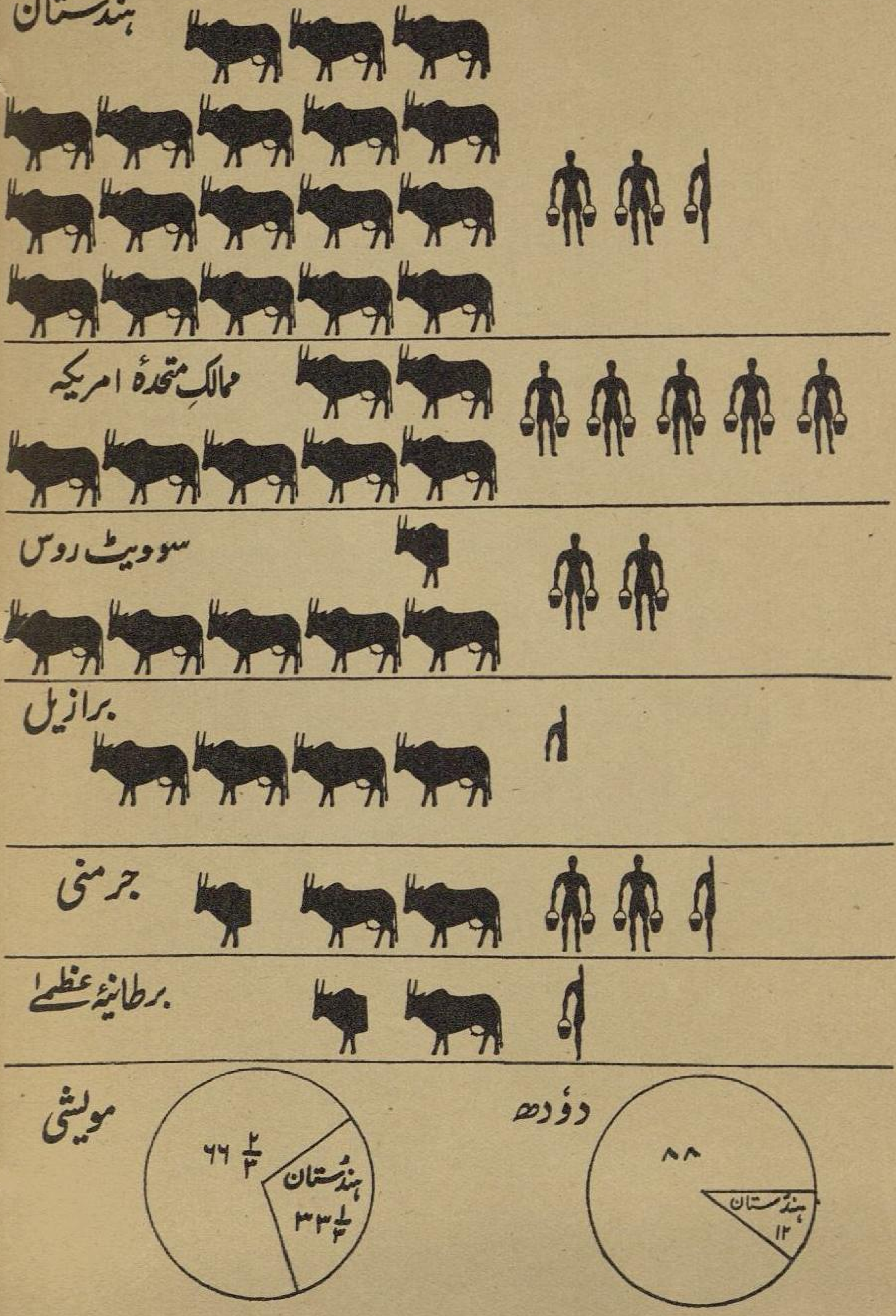
آخر اس کا سبب کیا ہے؟ کیا ہم واقعی "بڑے" خدا ترس

اور رحم دِل واقع ہوئے ہیں؟ دُوسرے مُلکوں میں جب مویشی ضرورت سے زیادہ ہو جاتے ہیں تو لوگ اُنھیں کاٹ کر کھا جاتے ہیں۔ مگر ہندُستان میں ہندو گائے بیل کو مقدّس مانتے ہیں اور ہم عموماً ناکارہ سے ناکارہ جانور کو بھی جان سے مارنا بُرا سمجھتے ہیں۔ چاہے وُہ بھوک سے تڑپ تڑپ کر کیوں نہ مرجائے۔ ہمیں اُس کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی۔ ہم پر تو یہ شعر صادق آتا ہے ؎

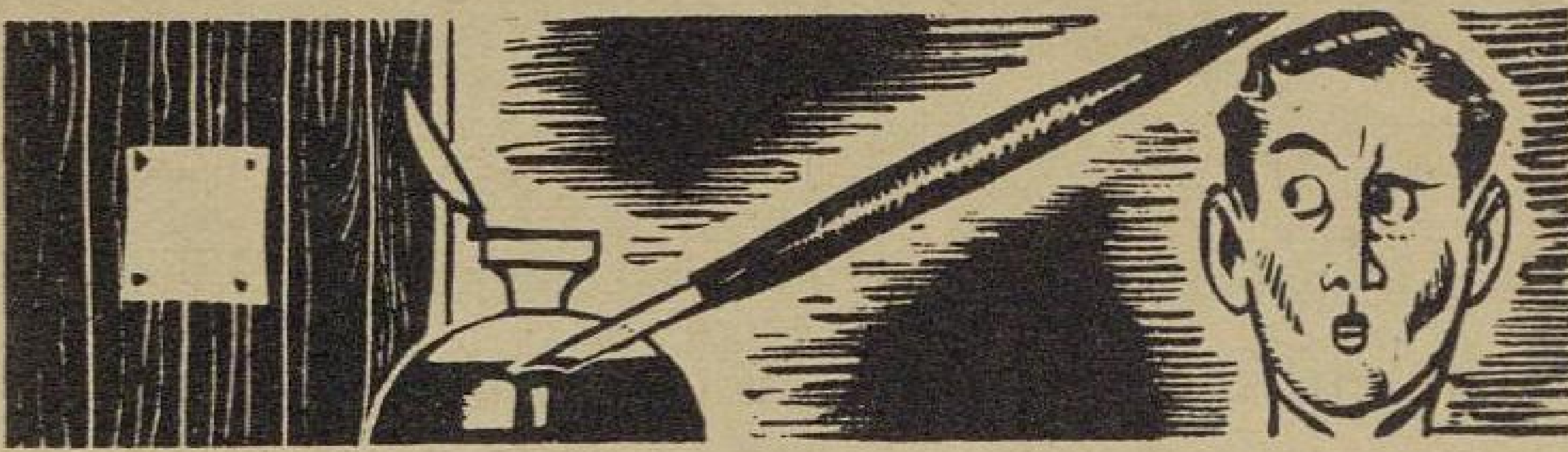
نہ چارا اُن کو دیتے ہیں، نہ اُن کو ذبح کرتے ہیں
عجب حالت ہے ڈھوروں کی نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

میں تو یہ کہتا ہُوں۔ کہ مویشی کم ہوں تو ہُوا کریں مگر جتنے بھی ہوں اُنھیں غذا اچھّی دی جائے اور اُن کی دیکھ بھال اچھّی طرح سے کی جائے۔ یہ رحم دِلی اور خُدا ترسی کا کام بھی ہے، اِس سے جانور بھی زیادہ کارآمد ہو جائیں گے اور گائے بھینسیں بھی زیادہ دُودھ دیں گی۔ آج کل تو یہ کیفیت ہے کہ سو میں سے ستر گائیں بھینسیں تو دُودھ ہی نہیں دیتیں اور جو دُودھ دے رہی ہیں اُن میں سے بھی کئی، ۵ پونڈ دُودھ دینے کے بجائے صرف ڈیڑھ پونڈ دُودھ روزانہ دیتی ہیں ۔

دیکھو اِس تصویر میں ایک مویشی ایک کروڑ مویشی کو ظاہر کرتا ہے اور گوالوں کی تعداد ہر مُلک کے دُودھ کی مقدار کی مناسبت سے بتائی گئی ہے۔ اب اِسے دیکھنے سے واضح ہوگا کہ جرمنی میں اڑھائی کروڑ مویشی سے اُتنا ہی دُودھ نکالا جاتا ہے جتنا کہ ہمیں ۱۸ کروڑ مویشی سے ہندُستان میں مِلتا ہے ۔


ہندوستان
ممالکِ متحدۂ امریکہ
سوویٹ روس
برازیل
جرمنی
برطانیۂ عظمیٰ
مویشی
۶۶ ۲/۳
ہندوستان
۳۳ ۱/۳
دودھ
۸۸
ہندوستان
۱۲

اب تک تو ہم زمین کے لیے کھاد، آبپاشی کے نئے طریقے، کاشتکاری کے جدید آلات اور مضبوط مویشی کی فکر میں رہے۔ مگر سب سے پہلے تو ہمیں کاشت کے لیے کافی زمین کی ضرورت ہے۔ کیوں ہے نا یہی بات؟ مگر افسوس ہمارے پاس زمین کافی نہیں ہے۔ اب تُم کہوگے "یہ کیا! ہندُستان جیسا وسیع مُلک اور کھیتی باڑی کے لیے زمین ناکافی؟" اِس سے شاید تُم کو شبہ ہوگا کہ یکایک میرا دماغ چل گیا ہے۔ ذرا دم لو، پریشان مت ہو! میں تمھیں بتاؤں گا کہ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ایک سچّا اور دردناک واقعہ ہے ۔



ساتواں باب

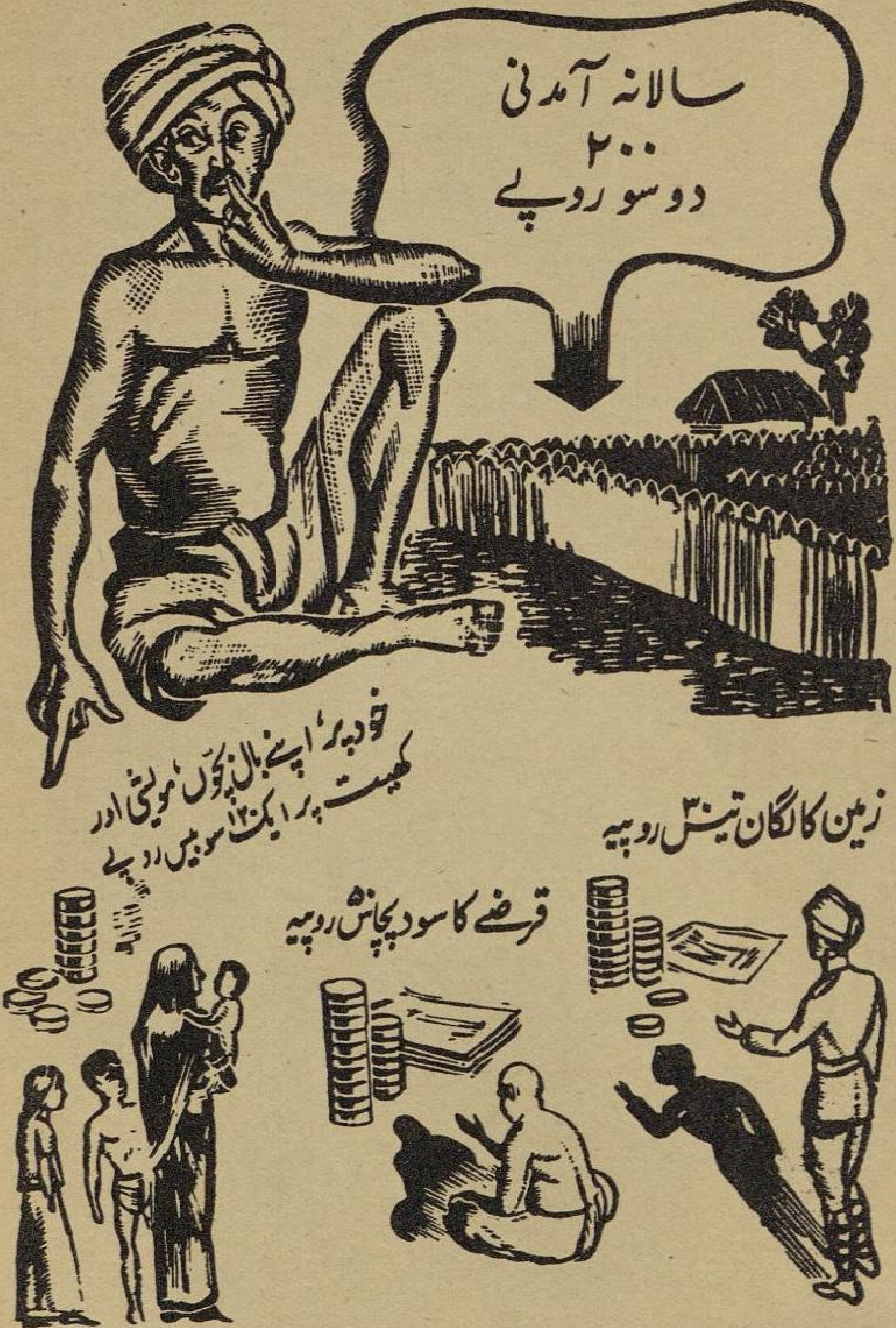
زمین کافی نہیں ہے!

اگر کوئی تمھیں کاغذ کا ایک صفحہ دے کر کہے کہ اِس پر ایک لمبا چوڑا مضمون لکھ دو تو کیا یہ مُمکن ہے؟ بھئی، میں تو سمجھتا ہوں کہ تم نہ لکھ سکوگے۔ یا اگر میں ایک گز اُون دے کر کہوں کہ اِس سے ایک بنیان بُن دو، تو میری پیاری بہنو! تم اِس کی کوشش کرنے کا خیال بھی نہ کروگی! مگر ہم اپنے کسانوں سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ اپنے خاندان کی گزر کے لیے کافی مقدار میں گیہوں، گنّا یا روئی پیدا کریں گے جب کہ اُن کے پاس اِس کے بونے کے لیے کافی زمین ہی نہیں ہے۔

اچھا چلو، دیکھیں ہمارے دوست راما کے پاس کتنی زمین ہے۔ اُس کے پاس بھی دوسرے کسانوں کی طرح چار ایکڑ زمین ہے۔ پھر وہ بھی ایک جگہ نہیں بلکہ بکھری ہوئی ہے۔ ایک ٹکڑا

کہیں ہے تو دُوسرا کہیں، ایک ٹکڑا ایک کسان کے کھیت میں ہے تو دُوسرا کسی دُوسرے کے کھیت میں۔ اِس تمام اراضی سے اُسے تقریباً دو سو روپے سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے۔ جس میں سے وہ تیس روپے تو حکومت کو لگان کے دیتا ہے اور پچاس روپے گانو کے مہاجن کو اُس قرض کے سُود میں دیتا ہے جو اُس نے مہاجن سے لیا تھا۔ اِس طرح اُس کے پاس صرف ایک سو بیس روپے بچتے ہیں جنھیں وہ اپنے آپ پر، اپنی بیوی، تین بچوں، تین بیلوں ایک گائے اور کھیت پر خرچ کرتا ہے۔ اِس کے یہ معنی ہوئے کہ گویا اُسے دس روپے مہینہ پڑتا ہے! تو کیا تعجب ہے اگر اُس کے بال بچے دھجیاں لگائیں اور فاقہ کشی کریں خود وُہ ملیریا اور اُس کے بچے سُوکھے کی بیماری (rickets) میں مُبتلا ہوں؟ اُس کے مویشی بے آب و دانہ سُوکھ کر کانٹا ہو جائیں اور اُس کی گائے ڈھائی سیر کی بجائے صرف تین پاو دُودھ دے! اِن حالات میں کیا تعجب ہے اگر وہ سب ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں ایک طرف اور اُس کے مویشی دُوسری طرف زندگی بسر کریں؟

کیا تُمھیں معلوم ہے کہ دُوسرے مُلکوں کے کسانوں کے پاس کتنی زمین ہوتی ہے؟ برطانیہ کا کسان ۲۶ ایکڑ اور کینیڈا کا ۱۴۰ ایکڑ زمین کاشت کرتا ہے۔ پھر ہمارے راما اور دُوسرے کسانوں پر کیا مُصیبت آئی ہے کہ اُن کے پاس تین یا چار یا پانچ ایکڑ سے زیادہ زمین نہیں ہوتی؟ اِس کا جواب ہے "قانونِ طلب و رسد" (Law of Supply & Demand) کھانا کم اور کھانے والے زیادہ۔


سالانہ آمدنی
۲۰۰
دو سو روپے
خود پر، اپنے بال بچوں، مویشی اور
کھیت پر ایک ۱۲۰ سو بیس روپے
زمین کا لگان تیس ۳۰ روپیہ
قرضے کا سود پچاس ۵۰ روپیہ

یہ تو وُہ مثل ہے کہ ایک انار اور صد بیمار ؛ بس یہی حالت ہماری بھی ہے - ذرا سی زمین اور بہت سے لوگ - ہندُستان کی آبادی ہر سال برابر بڑھتی چلی جا رہی ہے مگر ہندُستان کا رقبہ جیسے کا ویسا ہی ہے - دوُسرے مُلکوں کی بھی یہی کیفیّت ہے مگر وہاں شہروں میں کارخانے قائم کر دیے گئے ہیں - اِس لیے گانو کے لوگ کارخانوں میں کام کرنے کے لیے شہروں میں آ بسے - چنانچہ جرمنی میں ۱۸۷۰ء سے لے کر ۱۹۱۴ء تک کوئی ڈھائی کروڑ دیہاتی صنعت و حرفت کی بدولت اپنے گانوؤں کھیڑوں کو چھوڑ کر شہروں میں آباد ہوگئے - مگر ہمارے مُلک میں چار آدمیوں میں سے تین آدمی کھیتی باڑی کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں - اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ آدھے سے زیادہ آدمیوں کے پاس کاشت کے لیے کافی زمین نہیں ہے ؟

راما کے دادا کے پاس راما سے زیادہ زمین تھی مگر اُس کے چار لڑکے تھے - جب وہ مرا تو چاروں بھائیوں نے زمین کے حصے بخرے کر کے اُسے آپس میں بانٹ لیا - ہندوؤں کا قانون یہ ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد جایداد کے برابر کے حصّے کر دیے جائیں - اِس وجہ سے ہر ایک کو اراضی کا ایک چوتھائی حصّہ مِلا - جب راما کا باپ مرا تو راما اور اُس کے بھائیوں نے اپنے باپ کی زمین کو پھر برابر برابر حصّوں میں بانٹ لیا - اِس طرح ہر ایک کے پاس صرف چار چار ایکر زمین رہ گئی ؟

اب یہ چار ایکر زمین بھی ایک مقام پر نہیں ہے - اُس کا

ایک ٹکڑا کہیں ہے تو دُوسرا کہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب کبھی زمین کو مساوی حصّوں میں تقسیم کرکے آپس میں بانٹتے تو ہر ایک بھائی مختلف قسم کی زمین کا ایک ایک ٹکڑا لینا چاہتا تھا اور اُس کی تقسیم سوائے اُس طریقے کے کسی دُوسری طرح قطعی ناممکن ہے! اِس طرح ہر ایک کے حصّے میں اچھی زمین کی ایک پٹّی، معمولی زمین کا ایک ٹکڑا اور خشک زمین کی ایک پٹّی پڑی۔ یہ پٹّی کیا ہے؟ چھوٹا سا ایک ٹکڑا جو کسی بڑی زمین کو بہت سے حصّوں میں تقسیم کرنے پر حاصل ہوتا ہے۔ بس یہی کیفیت ہمارے مُلک کے کھیتوں کی ہے۔ بعض جگہ یہ ٹکڑے اور پٹّیاں اِس قدر چھوٹی ہوگئی ہیں کہ ہل مارتے وقت بیل مُشکل سے پھر سکتا ہے!



اِس چیز کو تاریخ کی کتابوں میں تقسیمِ اراضی (Fragmentation of Holdings) یا 'mingling-mangling' کہتے ہیں۔ اب نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ بعض لوگ درختوں کو تقسیم کرتے وقت صرف درخت ہی نہیں بلکہ اُس کی شاخوں اور پھلوں کو بھی تقسیم کر لیتے ہیں!

اِس کا نتیجہ؟ حیوانی اور اِنسانی قُوّت کی بربادی۔ چنانچہ راما بالکل سُست اور نکمّا ہوگیا اور وُہ سال میں چار مہینے گھر میں بیٹھا مکھیاں مارتا رہتا ہے۔ وُہ بیلوں سے بھی کوئی کام نہیں لیتا اور یہ کوٹھوں میں بندھے جُگالی کرتے رہتے ہیں۔ چونکہ زمین چھوٹی

پٹیوں میں تقسیم کر دی گئی ہے۔ اِس لیے ہر پٹّی کے گرد باڑھ لگانے میں بہُت صرفہ بیٹھتا ہے۔ مویشی کے لیے میدان صاف ہوگیا ہے اور وہ بغیر کسی روک ٹوک کے کھیت میں گھُس کر فصل کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ اب بتاؤ کہ اِتنی چھوٹی چھوٹی پٹیوں کے لیے قیمتی مشینیں اور ٹریکٹر خریدنے سے کیا فائدہ؟ اگر نہریں بھی ہوں تو ایسی صورت میں اُنھیں بغیر دوسرے لوگوں کی زمینوں میں سے لائے اِن چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کس طرح پانی پہنچا سکتے ہیں؟ بس یہی جھگڑے کا گھر اور فساد کی جڑ ہے۔



تجربے سے پتا چلا ہے کہ راما کی طرح کوئی کسان جس کے پانچ بال بچے اور دو بیل ہوں وہ سب کے سب کم سے کم بیس ایکڑ زمین پر گزارا کر سکتے ہیں اور فصل کے موقع پر دو تین مزدوروں کو بھی مقرر کر کے اُن سے متفرق کام لے سکتے ہیں۔ اِس طریقے سے راما کی پیداوار میں موجودہ پیداوار سے پانچ گنا زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔ تُم نے دیکھا کہ اِس سے جلانے کے لیے ایندھن اور بونے کے لیے اچھے تخم اور کھیتی باڑی کرنے کے لیے نئے آلات خریدنے میں اُسے کتنی

سہولت ہو جاتی ہے ٭

کیا کوئی ایسی ترکیب ہے کہ ہم راما کو سولہ ایکڑ زمین اَور دے سکیں ؟ کیوں نہیں ؟ ایک ترکیب تو یہ ہے کہ اُس کے کسی ہمسائے سے زمین لے کر اُسے دے دی جائے ۔ یہ طریقہ دُوسرے مُلکوں میں بھی رائج ہے ۔جہاں کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو ملاکر ایک بڑا سا کھیت بنا دیا جاتا ہے ۔مگر جن لوگوں کی زمین لی گئی پھر اُن کا کیا حشر ہوگا ؟ دُوسرے مُلکوں میں تو اُنھیں شہروں کے کارخانوں میں مزدُوری مِل جائے گی ۔ مگر ہمارے ہاں تو کارخانے بہُت ہی کم ہیں ۔ لیکن یہاں پندرہ کروڑ ایکڑ قابِل کاشت زمین بے کار پڑی ہے ۔اگر اُسی کو جوتا جائے تو ہر کسان کی زمین میں کچھ اضافہ ہو سکتا ہے ۔اِس طرح ہر کسان کو ایک ایکڑ زیادہ زمین دی جا سکتی ہے ۔اُس کے بعد کیا کِیا جائے ؟

ایسی حالت میں راما اور اُس کے ہمسائے کے لیے ایک ہی صوُرت ہے ۔ وُہ یہ کہ دونوں مِل کر اُس باڑھ کو اُکھاڑ دیں جو اُس کی زمین کو الگ الگ کر رہی ہے اور دونوں مِل کر پوُری زمین کو اِس طرح جوتیں بوئیں کہ گویا وُہ دونوں حِصّے دار ہیں ٭

فرض کرو کہ راما کے چاروں ہمسایوں میں سے ہر ایک کے پاس چار چار ایکڑ زمین ہے تو اِس حساب سے گویا جُملہ بیس ایکڑ زمین ہوئی ۔ اب اُنھیں اِس زمین سے کِتنا فائدہ حاصل ہوگا ؟ تم کہو گے "راما کی موجوُدہ آمدنی سے پانچ گُنا زیادہ" یہ غلط ہے ! کیا تُم نہیں جانتے کہ جب پانچ آدمی مل کر کام کرتے ہیں تو ہمارا پُرانا



دوست "تقسیم کار" بیچ میں آجاتا ہے؛ راما اور اُس کے شریک کو پتا چل جاتا ہے کہ اُن میں سے ہر ایک میں ایک خاص قسم کا کام کرنے کی "قابلیت" ہے؛ یعنی بعض کسی کام کو نہایت حُسن و خوبی سے کرتے ہیں تو بعض دوسرے کسی کام کو بہترین طریقے سے انجام دیتے ہیں۔ مگر جب وُہ اپنے چھوٹے سے کھیت میں بیٹھ کر چھوٹے پیمانے پر کام کرتے تھے تو اُن پر یہ مثل صادق آتی تھی کہ "ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا" مگر اب ہر شخص کسی خاص کام پر پوری توجہ کرتا ہے اِس لیے زمین میں پانچ یا چھے گُنا ہی نہیں بلکہ سات گُنا زیادہ پیداوار ہو سکتی ہے۔

اِس کے علاوہ اب اُنھیں زیادہ مویشی کی ضرورت نہیں ہو گی، ایک جوڑ بیل بہت کافی ہے۔ وُہ بقیہ چار جوڑ بیلوں کو کسی کے ہاتھ فروخت کر سکتے ہیں۔ اِس طرح اُن کے اخراجات میں کمی ہو جائے گی اور بیلوں کی چروائی میں جو خرچہ ہوتا تھا وُہ بچ رہے گا۔ اِس رقم



سے وُہ کوئی مشین یا کوئی بہترین قسم کا کھاد خرید سکتے ہیں جو اُن کی پیداوار اور زمین کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگا۔ تُم نے دیکھا کہ بعض اوقات۔ ہمیشہ نہیں۔ ۵ × ۴ = ۳۰ ہوتے ہیں! دیکھتے ہو! جہاں اِتّحاد ہُوا وہاں یہی ہوتا ہے؛ یعنی چار آدمیوں نے مل کر کسی کام کو انجام دِیا تو یہی نتیجہ ہوتا ہے اور اُن میں سے ہر ایک کو مُنافع ہوتا ہے۔ ہندُستان میں بھی کہیں کہیں ایسا ہُوا ہے۔ خصوصاً پنجاب میں۔ اور اُس کے شاندار نتیجے حاصل ہوئے ہیں۔ اب ہمارے مُلک کو جس بات کی سب سے زیادہ ضرُورت ہے وُہ اتحادی کاشتکاری یعنی ساجھے کی کھیتی ہے۔

اِس کی ابتدا ہماری قابلِ کاشت زمین سے نہایت اچھّی طرح سے کی جاسکتی ہے جو اِس وقت بے کار پڑی ہوئی ہے اور جس کا رقبہ تقریباً پندرہ کروڑ ایکڑ ہے۔

یہ زمین یقینی خراب ہے۔ ورنہ اِس کو بے کار نہ رہنے دیا جاتا۔ اِس میں سے اگر ہر ایک کھیت سو سو ایکڑ کا بناکر وہاں چار چار کاشتکاروں کو مع اُن کے خاندانوں کے آباد کر دیں، ہر ایک کھیت پر پانچ پانچ سو روپے خرچ کرکے آبپاشی کے ذرائع پیدا کریں، منڈیوں تک راستے تعمیر کروائیں، کھیتی باڑی کے لیے مویشی اور مشینیں خریدیں تو کہتے ہیں کہ پوُرے رقبے سے دس سال کے بعد سے ۸۰۰ کروڑ روپے سالانہ کا اناج اور خام پیداوار ہوگی جو موجُودہ کُل زیرِ کاشت زمین کی پیداوار کی دو تہائی ہوگی۔

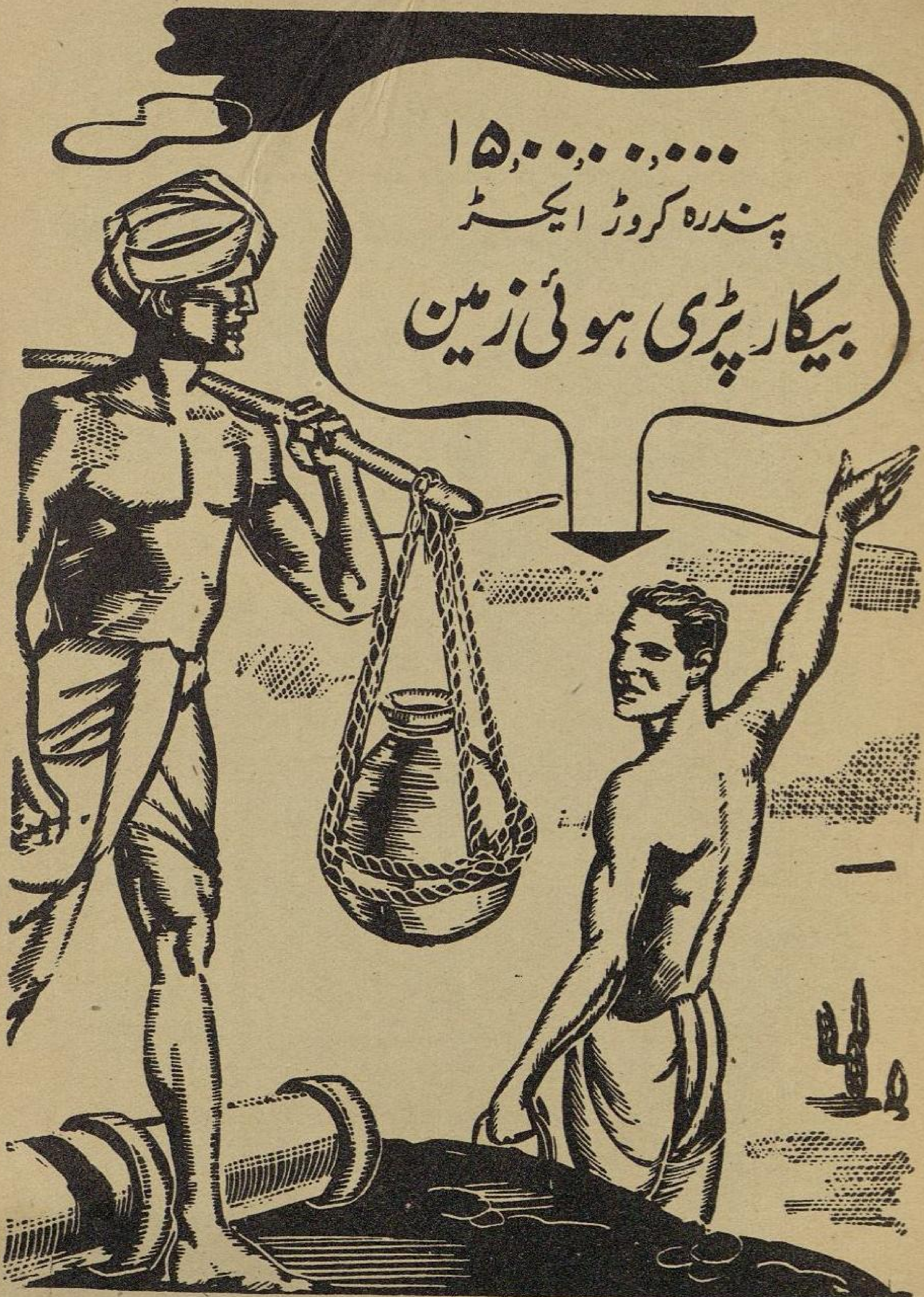
یہ کیا خوُب ہوگا۔ مگر ہم اپنی بہترین زمین کو پُرانے طریقوں

پر کاشت کرنے کے لیے کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ لیکن مُصیبت یہ آ پڑی ہے کہ اگرچہ اتحادی کاشتکاری یا ساجھے کی کھیتی کا طریقہ عُمدہ ہے مگر ہمارے کسان بے وقوف ہیں اِس لیے حکومت کو چاہیے کہ وُہ بیچ میں پڑکر کسانوں کے کھیتوں کو بڑا کر دے۔

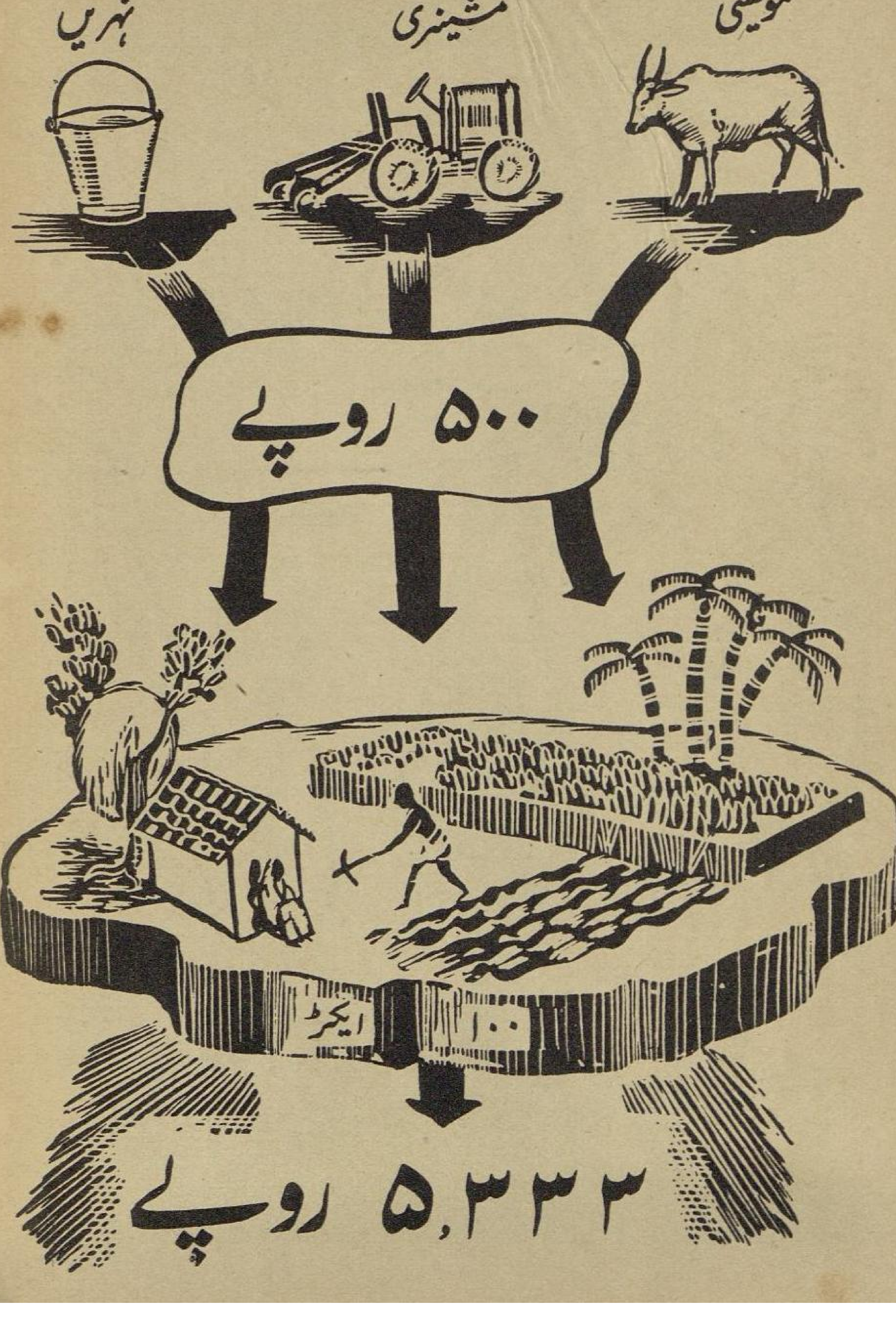
جرمنی میں ہٹلر کی حکومت نے یہ قانون نافذ کر دیا ہے کہ ہر کھیت کو اِس قدر بڑا ہونا چاہیے کہ جس کی پیداوار سے ایک خاندان آسانی سے پل سکے۔ اُسے کھانے پینے کا سامان، پہننے کو کپڑے لتے اور دُوسری ضرُوری اشیا آسانی سے فراہم ہو سکیں۔ اِس قانون میں بہت بڑے کھیت رکھنے کی بھی ممانعت ہے تاکہ ہر ایک آدمی بہت زیادہ زمین خرید کر دُوسرے آدمیوں کو اُن کی زمینوں سے نہ محرُوم کر سکے۔ جو کھیت اِس قانون کے مُطابق بنائے گئے ہیں وہ نہ تو تقسیم کیے جا سکتے ہیں، نہ قول پر دِیے جا سکتے ہیں اور نہ مہاجن کے پاس رہن رکھے جا سکتے ہیں۔

سوویٹ رُوس میں حکومت نے اتحادی کاشتکاری یعنی ساجھے کی کھیتی بڑے پیمانے پر کر دی ہے جس میں سیکڑوں آدمی کام کرتے رہتے ہیں۔ اتحادی گانو میں سب سے بڑے کا نام جگانٹ (Gigant) ہے جو حقیقت میں بہت بڑا ہے۔ واقعی وُہ اسم بامسمّیٰ ہے: یعنی دُنیا بھر میں گیہوں کی پیداوار کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ شمال سے جنوب تک پچاس میل لمبا اور مشرق سے

ل مؤلف نے اِس گانو کے نام کی تعریف کرتے ہوئے انگریزی لفظ (Gigantic) کے استعمال سے ایک لُطف پیدا کیا ہے۔ مترجم



۱۵,۰۰,۰۰,۰۰۰
پندرہ کروڑ ایکڑ
بیکار پڑی ہوئی زمین



نہریں
مشینری
مویشی
۵۰۰ روپے
۱۰۰ ایکڑ
۵,۳۳۳ روپے

مغرب تک چالیس میل چوڑا ہے۔ یہاں سترہ ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ اس میں فصل کاٹنے کی ایک بہت بڑی مشین ہے جو کئی کام کرتی ہے؛ یعنی یہ اناج اکٹھا کرتی ہے، گاہتی ہے اور اناج پھٹکتی ہے۔ اِس مشین پر ایک آدمی کام کرتا ہے مگر یہ اکیلی مشین سو آدمیوں کا کام کرتی ہے۔ یہ زبردست کارخانہ بے در و دیوار اور "بے چھت کے قائم ہے جو دُنیا کی "تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہے! یہ ایک حیرت انگیز اِنقلاب ہے، اِس لیے کہ



۱۹۱۷ء میں رُوسی اِنقلاب سے پہلے رُوسی کِسان اُسی طرح چھوٹے چھوٹے زمین کے ٹکڑے جوتتے تھے جس طرح کہ آج کل ہمارے کِسان اور وہ بھی ویسے ہی کنگال تھے جیسے کہ آج کل ہمارے کسان ہیں۔ رُوسی کسان لمبے لمبے قدم ڈال کر آگے بڑھ گئے اور ہمارے کِسان اور بھی پیچھے رہ گئے ؛

ٹریکٹر جو عام طور پر فولادی گھوڑے کے نام سے مشہور ہے، وُہ رُوسی کسانوں کا بہترین دوست ہے۔ ۱۹۳۵ء میں جب میں رُوس میں تھا تو میں نے ہوائی جہاز پر سے رُوس کی ہزاروں میل زمین دیکھی۔ میں نے دیکھا کہ وہاں کی زمین اِنگلستان، فرانس یا ہندُستان کی زمینوں سے بالکل مُختلف ہے۔ اُن مُلکوں میں زمینیں جگ سا کے معموں (jigsaw puzzle) کی طرح ہوتی ہیں؛ یعنی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین مُختلف شکل کے ٹکڑوں اور مُختلف جسامت

کی پٹیوں میں تقسیم کر دی گئی ہے۔ مگر رُوسی منظر شطرنج کی بساط کی طرح ہے۔ جہاں کھیت چوکور خانوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں، ور گھر یا گھاس کی گڑیاں شطرنج کے مہروں کی طرح دکھائی دیتی ہیں ؛

میں نے سوویٹ رُوس کے آرمینیائی علاقے میں جاکر ایک گانو دیکھا جہاں گزشتہ دس سال سے کسانوں نے کھیتی باڑی کرنے کا پُرانا طریقہ چھوڑ کر اتّحادی کاشتکاری اختیار کر لی تھی۔ یہ چھوٹا سا معمُولی گانو ہے جو پراکار کے نام سے مشہور ہے۔ اِس میں ۲۵۰ خاندان مِل جُل کر کام کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ رُوئی کی پیداوار ۲۴۰ کیلوگرام فی ایکڑ سے ۴۸۰ کیلوگرام تک پہنچ گئی۔ میں نے ایک کسان سے اِس کے متعلّق بات چیت کی تو معلوم ہُوا کہ پہلے جب وُہ اپنی زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا کاشت کرتا تھا تو اُسے صرف ۱۵۰ رُوبل[۲] ماہانہ ملتے تھے۔ اور اب جب سے وُہ اتّحادی کاشتکاری کر رہا ہے تو ۵۰۰ رُوبل ماہانہ کما رہا ہے ؛

مجھے یقین ہے کہ اگر ہم بھی ایسا ہی کریں تو ہندُستان میں بھی ایسے ہی حیرت انگیز نتائج ہوں گے۔ صرف پانچ بڑے کام اگر ہم کر لیں تو ہم بھی اپنی زمین سے اُتنی ہی پیداوار حاصل کر لیں گے جتنی کہ انگریز اپنی زمینوں سے حاصل کرتے ہیں۔ پھر ہماری کھیتی باڑی کاغذ کی ناو نہیں ہوگی جو پانی میں بیٹھ جائے گی بلکہ

---

[۱] کیلوگرام ۲ء۲ پونڈ کے برابر ہوتا ہے ؛ [۲] رُوبل رُوس کا طلائی سِکّہ جو تقریباً ڈیڑھ روپے کے برابر ہوتا ہے ؛

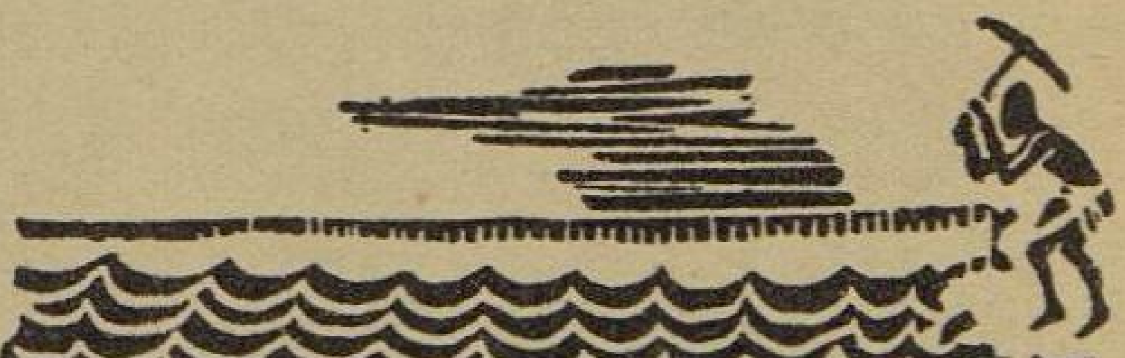
ایسی ہوگی جو ہوا اور موجوں کا مقابلہ کرے گی اور برابر تیرتی رہے گی۔
وہ پانچ باتیں یہ ہیں :

اتّحادی کاشتکاری
یا
ساجھے کی کھیتی



(۱) چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو ملاکر ایک بڑا کھیت بنائیں جو بیس ایکڑ سے کم نہ ہو۔ قابلِ کاشت زمین جو بے کار پڑی ہے اُس کے سو سو ایکڑ کے بڑے بڑے کھیت بنائے جائیں اور چھوٹے موٹے کسان جو دوسری زمینیں جوت رہے ہیں اُنھیں اپنے ہمسایوں سے مِل جُل کر کام کرنے کی ترغیب دِلائی جائے تاکہ وُہ اتّحادی کاشتکاری میں حِصّہ لیں۔

نہریں



(۲) نہریں اور باؤلیاں کثرت سے تعمیر کرائی جائیں جن سے ہمارے مُلک کا نہ صرف پانچواں حِصّہ بلکہ کُل رقبہ سیراب ہو سکے ❖

جنگل اور کھاد



(۳) جنگل لگانے چاہئیں، اُن کی حفاظت کرنی چاہیے اور اُن سے لکڑی حاصل کرنی چاہیے تاکہ وُہ ایندھن کے کام میں لائی جائے اور گوبر کھاد کے طور پر استعمال ہو ۔

مشینری اور بیج



(۴) کسانوں کو مشینری استعمال کرنا سکھایا جائے ۔

مویشی



(۵) نکمّے اور فاقے زدہ مویشی کو کم کیا جائے۔ جو مویشی رکھے جائیں اُنھیں اچھی غذا دی جائے ۔

اگر ہم نے ایسا کیا تو ہم ہندُستان کی کایا پلٹ دیں گے۔ اور چند روز میں اُس کی یہ روتی ہوئی شکل ہنستی ہوئی نظر آنے لگے گی۔ مگر یہ سب کچھ کرنے کے لیے تمھیں ایک کام سب سے پہلے کرنا پڑے گا۔ وُہ یہ ہے کہ جن کسانوں کی گانو میں کھپت نہیں ہو سکتی اُن کے لیے کوئی کام تجویز کیا جائے ۔

آٹھواں باب

پودوں پر اُون[1]

"ہندُستان میں ایک خاص قسم کا پودا ہوتا ہے جس میں بجائے پھل کے بھیڑوں کے اُون سے بھی زیادہ اور عُمدہ قسم کی اون لگتی ہے، جس سے ہندُستانی کپڑے بناتے ہیں" یہ اُس عجیب و غریب پودے کپاس[2] کی تعریف ہے جو ایک یونانی مؤرّخ ہیروڈوٹس (Herodotus) نے آج سے دو ہزار سال پہلے کی تھی۔ قدیم زمانے میں ایک اور سیّاح ہندُستان آیا۔ اُس نے بھی کپاس کو دیکھ کر بہُت تعجّب ظاہر کیا۔ وُہ لکھتا ہے "یہ ایک میمنہ ہے جو پودے سے نکلتا ہے اور اپنے چاروں طرف کے پودوں کو کھا جاتا ہے"

حال ہی میں جب کہ سندھ میں موہنجودارو کے قدیم شہر کا پتا لگا تو وہاں کا پُرانا طرزِ تمدّن معلوم کرنے کے لیے اُن کھنڈروں کو کھودا گیا تو وہاں سُوتی کپڑے نکلے۔ جاننے والے کہتے ہیں کہ یہ پانچ ہزار سال پہلے کے ہیں! اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ کپاس

---

[1] بھیڑ کے بالوں کو کہتے ہیں۔

[2] وُہ رُوئی جس میں سے بنولے یا بیج جُدا نہ کیے گئے ہوں۔ مترجم

کا استعمال سب سے پہلے ہم نے کیا اور رُوئی سے کپڑا بنانے کی صنعت ہندُستان میں قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ اب بھی یہ ہماری سب سے بڑی صنعت ہے اِس لیے ہم اِس باب میں اِس پر غور کریں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ ابتدا سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے تک ہندستان کا بنایا ہُوا کپڑا ایشیا اور یوُرپ کے بازاروں میں فروخت ہوتا تھا۔ اپنی نرمی، خوبصورتی اور بُنت میں بے نظیر ہونے کے باعث ہندُستان کے جُلاہوں کے کام کی بہت قدر کی جاتی تھی۔ ڈھاکے کی ململ اِس قدر مہین ہوتی تھی کہ لوگ اُسے مکڑی کے جالے سے تشبیہ دیتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ شہنشاہ اورنگ زیب نے اپنی شہزادی سے خفا ہوکر کہا "تم اِتنے مہین کپڑے پہنتی ہو کہ جسم دِکھائی دیتا ہے"۔ شہزادی نے عرض کی "جہاں پناہ میرے جسم پر کپڑے کی سات تہیں ہیں!"

کیلی کو نام کالی کٹ سے ماخذ کیا گیا ہے جہاں یہ کپڑا بنتا تھا۔ ۱۷۰۰ء میں اِس کپڑے کے استعمال کرنے کی انگلستان میں قانوناً ممانعت کر دی گئی تھی۔ جس کی یہ وجہ تھی کہ اُس کپڑے کے مقابلے میں انگریزی کپڑے کی تجارت بند ہو گئی تھی۔ ۱۸۱۵ء تک بھی ہندُستان سے تیرہ لاکھ پونڈ کا کپڑا سالانہ صرف انگلستان کو بھیجا جاتا تھا۔ اِس کے بعد مشینوں کا دور دورہ ہُوا اور زمانے نے ایسا پلٹا کھایا کہ لنکا شائر کا کپڑا ہندُستان میں دھڑا دھڑ آنے لگا۔

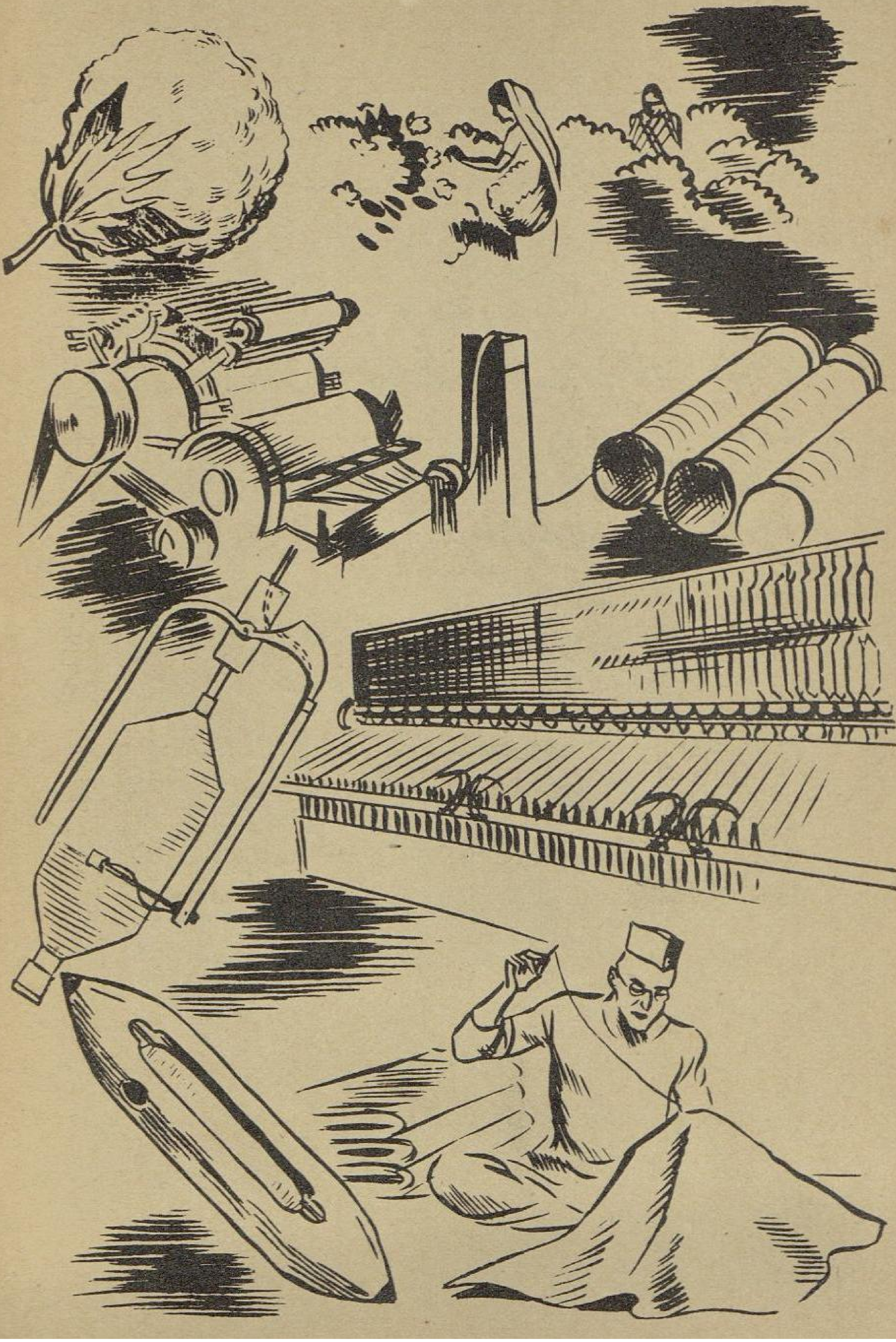
۱۸۵۳ء میں شاید پہلی مرتبہ بمبئی میں مشین سے کپڑا بنانے

کی گرنی قائم ہُوئی تھی - اب بمبئی میں تقریباً ۶۹ اور پوُرے ہندُستان میں ۳۹۰ گرنیاں ہیں جن میں کم و بیش چار لاکھ مزدُور کام کرتے ہیں - دوُسرا سب سے بڑا روُئی کی گرنیوں کا مرکز احمد آباد ہے ٭

اِن گرنیوں میں چار ارب گز کپڑا سالانہ تیار ہوتا ہے مگر یہ ہماری ضرورتیں دو تہائی سے بھی کم پوُری کرتا ہے - بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں سَوا چھے ارب گز کپڑے کی کھپت ہے - بقیّہ سَوا دو ارب گز کپڑا دو طریقوں سے مُہیّا کیا جاتا ہے - کچھ تو چھوٹی چھوٹی مشینوں کے ذریعے ہاتھ سے تیار کرتے ہیں جسے کرگا (hand-loom) کہتے ہیں - اِس پر تقریباً ۴۰ لاکھ آدمی کام کرتے ہیں اور کم و بیش ڈیڑھ ارب گز کپڑا تیار کرتے ہیں - بقیّہ پون ارب گز کپڑا دوُسرے مُمالک؛ مثلاً انگلستان یا جاپان سے خریدا جاتا ہے ٭

تُم کہوگے کہ یہ بھی عجیب لطیفہ ہے - جب کہ ہماری زمین کا ایک بہُت بڑا رقبہ کپاس کی کاشت کے لیے موزوُں ہے تو ہمیں اپنی ضرورت کے مطابق خود اپنے مُلک میں کپڑا تیار کرنا چاہیے تھا دوُسرے مُلکوں سے کپڑا کیوں خریدا جاتا ہے ؟

پھر یہ سُن کر تُمھیں اَور بھی حیرت ہوگی کہ سوائے بنگال، بہار، آسام اور شمال مغربی سرحدی صوُبے کے باقی تمام ہندُستان میں کپاس کی کاشت کی جاتی ہے - دُنیا میں ریاست ہائے متحدہٗ امریکہ کے بعد ایک ہمارا ہی مُلک ہے جہاں سب سے زیادہ روُئی پیدا ہوتی ہے اور ہم دوُسرے مُلکوں کو تقریباً ۳۰ لاکھ گٹھے سالانہ بھیجتے ہیں جس کی مقدار ہماری سالانہ پیداوار کی نصف ہوتی ہے - اِس



میں آدھی سے زیادہ روئی جاپان خریدتا ہے جو کپڑا بنانے میں ہمارا سب سے بڑا رقیب ہے۔ روئی سے وہ ہمارے استعمال کے لیے کپڑے تیار کر کے بھیج دیتا ہے۔ ہمارے مزدوروں کی کاہلی، ہماری گرنیوں کے مالکوں کی نااہلی اور بعض گرنیوں کی مشینوں کی فرسودگی



اور خرابی اس قدر ہے کہ خود ہماری روئی سے جو کپڑا جاپان تیار کر کے بھیجتا ہے وہ بمبئی اور احمد آباد کے بنائے ہوئے کپڑے کے مقابلے میں زیادہ سستا ہوتا ہے!

اس کے علاوہ ہمارے پاس کافی سے زیادہ روئی موجود ہونے

پر بھی گرنیوں کے مالک امریکہ، مصر اور افریقہ سے رُوئی منگواتے ہیں!
اِس کی وجہ؟ وجہ یہ ہے کہ ہماری رُوئی زیادہ تر "چھوٹے ریشے" کی ہوتی ہے اور اچھّی قِسم کے کپڑوں کے لیے "لمبے ریشے والی" رُوئی کی ضرورت ہے۔

اِس سے تین باتیں صاف ظاہر ہوتی ہیں: ہم تقریباً آدھی رُوئی دُوسرے مُلکوں کو بھیج دیتے ہیں، ہم باہر سے ایک دُوسرے قسم کی رُوئی خریدتے ہیں اور ہم اپنے لباس کا آٹھواں حِصّہ باہر سے منگاتے ہیں۔ اب اگر تُم اِن باتوں کو سوچنے بیٹھو تو معلوم ہوگا کہ ہمیں اِن تینوں باتوں میں سے "کسی ایک پر بھی" عمل کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔

پہلے تو یہ کہ ہم باہر سے رُوئی کیوں منگائیں؟ "ہمیں عورتوں کے لیے اعلیٰ قسم کی ساڑھیاں تیّار کرنے کے واسطے لمبے ریشے والی رُوئی کی ضرورت ہے"۔ چونکہ خوبصورت عورتیں مہاتما گاندھی کی ہدایت کے باوجود عُمدہ ساڑھیاں پہننے سے باز نہیں آتیں۔ اِس لیے ہمیں اُن کے لیے موزوں قسم کی کپاس کی کاشت کرنی چاہیے۔ لیکن ہم سرِدست بہت چھوٹے ریشے کی کپاس بو رہے ہیں اور لمبے ریشے والی کپاس کی نہایت ہی کم کاشت کرتے ہیں۔ ہمارے پاس زمین بھی اچھی ہے اور کسان بھی ہیں۔ اب کرنا یہ ہے کہ اُن کے لیے اچھے قِسم کا بیج مہیا کیا جائے، اُن کی امداد کی جائے اور اُنھیں ترغیب دی جائے کہ وُہ موجُودہ قِسم کی کپاس کے بدلے لمبے ریشے والی کپاس بوئیں۔ اگر اِس پر عمل ہُوا تو پھر یہاں باہر سے رُوئی کا ایک گٹھا

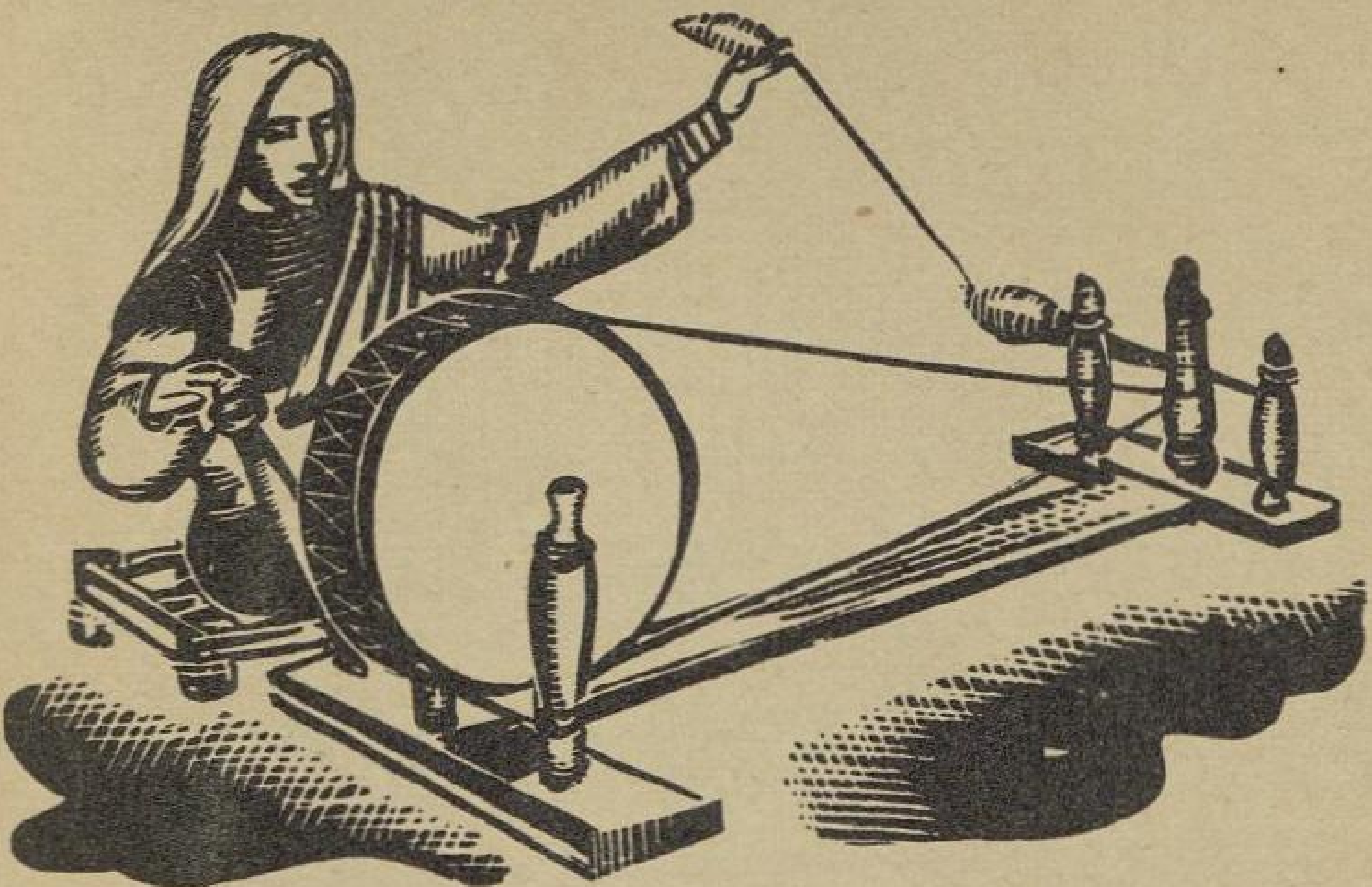
بھی نہیں آئے گا ؂

اُن بدیشی کپڑوں کی درآمد کا سُوال ابھی باقی ہے جو خاص کر لنکا شائر اور جاپان سے آتے ہیں۔ اگرچہ اِن کی درآمد اب کم ہوگئی ہے اور ہندُستانی گرنیوں کے بنے ہُوئے کپڑے اور ہاتھ سے بُنے ہوئے "کھدّڑ" کے استعمال نے بدیشی کپڑوں کی تجارت کو بہُت کچُھ بٹھا دیا ہے۔ پھر بھی باہر سے آنے والی چیزوں میں سب سے بڑی مداب بھی یہی ہے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ آخر ایک اُنگل کپڑا بھی ہمارے مُلک میں باہر سے کیوں آئے۔ خصوصاً وُہ کپڑا اور چیزیں جو چھوٹے ریشے والی رُوئی سے تیّار کی جا سکتی ہیں؛ جیسے موم جامے، مچھّردان، جُرّابیں، رُومال اور سینے پرونے کا تاگا وغیرہ ؂

ہم یہ دیکھ چُکے ہیں کہ سال میں چار مہینے ہمارے کسان بے کار بیٹھے مکھّیاں مارتے رہتے ہیں۔ وُہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھے رہیں؛ اِس سے بہتر مشغلہ کیا ہو سکتا ہے کہ اُنھیں رُوئی کاتنے اور کپڑا بُننے پر ایسے زمانے میں لگایا جائے جب کہ کھیت میں اُن کی ضرُورت نہیں ہوتی ؂

اگر ہمارے کسانوں کے گھروں میں چرخہ یا کرگا موجُود ہو تو خالی اوقات میں وہ اپنے بیوی بچّوں کو اِس کام میں لگا کر کپڑا تیّار کرا سکتے ہیں اور ایسے بازار میں فروخت کر سکتے ہیں جہاں اِس وقت بدیشی کپڑوں کی مانگ ہے ؂

ہاں، تم کہوگے کہ یہ بات تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر ہم اِنگلستان یا جاپان کا کپڑا نہ خریدیں تو پھر بھلا وُہ ہماری فاضل رُوئی کیوں



خریدنے لگے۔

یہ بات تو تُم نے پتے کی کہی، مگر اِس پر زیادہ توجّہ کی ضرورت نہیں۔ اِس لیے کہ فی الحال رُوئی کی وُہ بڑی مقدار جو ہم باہر بھیج رہے ہیں وہ اُن چرخہ کاتنے والوں میں تقسیم ہو جائے گی جن کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا۔

فرض کرو کہ کوئی غیر مُلک ہماری رُوئی بالکل نہ خریدے تو کیا ہوگا؟ بس یہی کہ وُہ پڑی رہے گی۔ اب سُوال یہ ہے کہ ہم اس رُوئی سے کیا کام لیں گے؟ یہ گُتھی بھی نہایت آسانی سے سُلجھ سکتی ہے۔

کیا تُم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ ہندُستان میں بُہت سے لوگ مہاتما گاندھی کی طرح اوچھے کپڑے کیوں پہنتے ہیں؟ ہندُستان

میں فی کس کپڑے کا خرچ اِس قدر کم ہے کہ جسے سُن کر تُمھیں حیرت ہوگی۔ سال بھر میں صرف ½۱۶ گز فی کس۔ اور اگر تُم اس میں عورتوں کی ساڑھیوں کی لمبائی بھی ملا دو تو مردوں کے لیے مشکل ہی سے کُچھ رہ جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں زیادہ تر لوگ پھٹے پُرانے کپڑے پہنے پھرتے ہیں اور جو مُلک کے سرد حِصّوں میں آباد ہیں وُہ جاڑے میں ٹھٹھرتے رہتے ہیں کیونکہ وُہ بالکل قلاّش ہیں۔ اُن کے پاس تو کوڑی کفن کو نہیں، پھر وُہ کپڑا کیا خاک خریدیں گے!

اب اگر کِسان کے پاس کُچھ پیسہ ہوتا۔ اور ابھی ہم بتا چُکے ہیں کہ نہایت آسانی سے وُہ پیسے والا ہو سکتا ہے۔ تو وُہ اپنے کپڑوں میں کُچھ اور اضافہ کر سکتا؛ یا فرض کرو کہ ہم کفایت سے کام لیں؛ یعنی اُسے سالانہ ایک اَور دھوتی اپنے لیے اور ایک ساڑھی اپنی بیوی کے لیے خریدنے کی اجازت دے دیں۔ تو پھر تُم دیکھوگے کہ ہماری تمام گرنیاں اور چرخے رات دِن چلتے رہیں گے اور تمام رُوئی کی پیداوار استعمال کر لیں گے۔

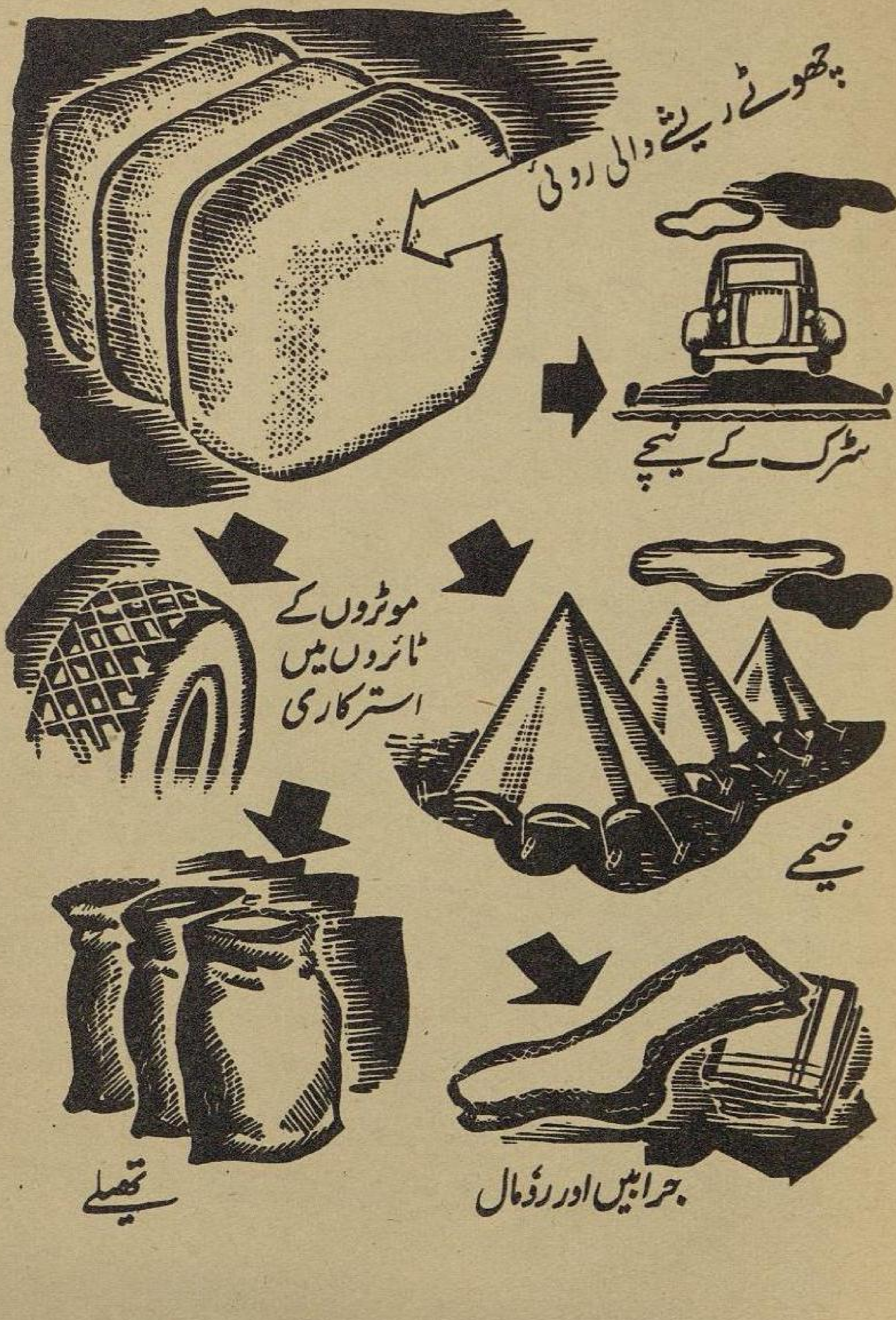
اِس کے عِلاوہ رُوئی سے صرف کپڑے ہی نہیں بُنے جاتے۔ اِس سے دُوسرے کام بھی لیے جاتے ہیں۔ اگر وُہ ضرورت سے زیادہ بچ رہے گی تو اُس کے کئی اور استعمال بھی ہمیں معلوم ہیں اور اگر ضرورت پڑی تو اِس کے عِلاوہ اور بھی کئی استعمال معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ رُوئی موٹروں کے ٹائروں کی استرکاری کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے۔ سڑکوں کی سطح کے نیچے، مُختلف چیزوں کی تہیں دے کر اُس میں پائیداری اور لچک پیدا کی جاتی ہے۔ ہم بجائے

اُن چیزوں کے رُوئی استعمال کر سکتے ہیں ؞

کرمچ جس پر پانی اثر نہیں کرتا پہلے سن سے بناتے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں جب جنگ چھڑی تو سن آنا بند ہو گیا۔ اب لوگ پن روک کرمچ (water-proof canvas) تیار کرنے کے لیے کوئی دُوسری چیز تلاش کرنے لگے۔ ہندُستان کی رُوئی اِس کام کے لیے موزُوں ثابت ہوئی۔ یہ دیکھ کر اِنگلستان نے چھیالیس لاکھ روپے کے سُوتی کرمچ تیار کرنے کا آرڈر دے دیا اور اب یہ نئی چیز لاکھوں گز یہاں تیار ہونے لگے گی۔ سُنا گیا ہے کہ رُوئی باندھنے کے گٹھے، تھیلے اور دُوسری چیزیں باندھنے کے کپڑے جو اب تک رُوئی سے تیار کیے جا رہے تھے اب اُنھیں رُوئی اور سن ملا کر تیار کرنے کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ یہ تمام چیزیں چھوٹے ریشے والی رُوئی سے تیار کی جا سکتی ہیں اور اب اِس سے زیادہ اور کیا چاہیے ؞

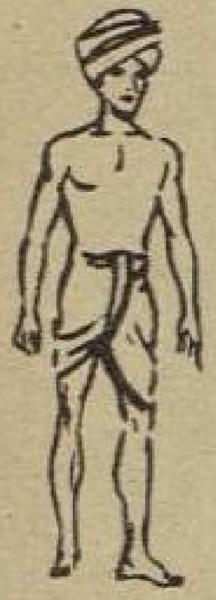
اِس لیے ہمیں یہ فکر نہیں کرنا چاہیے کہ ہماری رُوئی کون خریدے گا۔ یہاں جتنی رُوئی پیدا ہوتی ہے اُسے استعمال کرنے کے لیے خود ہمارے یہاں کافی آدمی موجُود ہیں ؞

ابھی ہم نے جو دو چار باتیں بیان کی ہیں اگر اُن پر ہی عمل کیا جائے تو یقین جانو کہ بدیشی کپڑا اور بدیشی رُوئی خریدنے کے لیے ہمیں باہر روپے بھیجنے کی ضرُورت نہ پڑے گی۔ اِس کے عِلاوہ لاکھوں کسان کام پر لگ جائیں گے جو ہر سال، سال میں چار مہینے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ پھر کیا ہے جس طرح یوُرپ اور امریکہ کے مرد اور عورتیں خوبصُورت اور دِلکش لباس پہنتی



چھوٹے ریشے والی روئی
سڑک کے نیچے
موٹروں کے
ٹائروں میں
استرکاری
خیمے
تھیلے
جرابیں اور رومال

ہیں ، ہمارے یہاں کے لوگ بھی اُسی قسم کا لباس پہننے لگیں گے۔



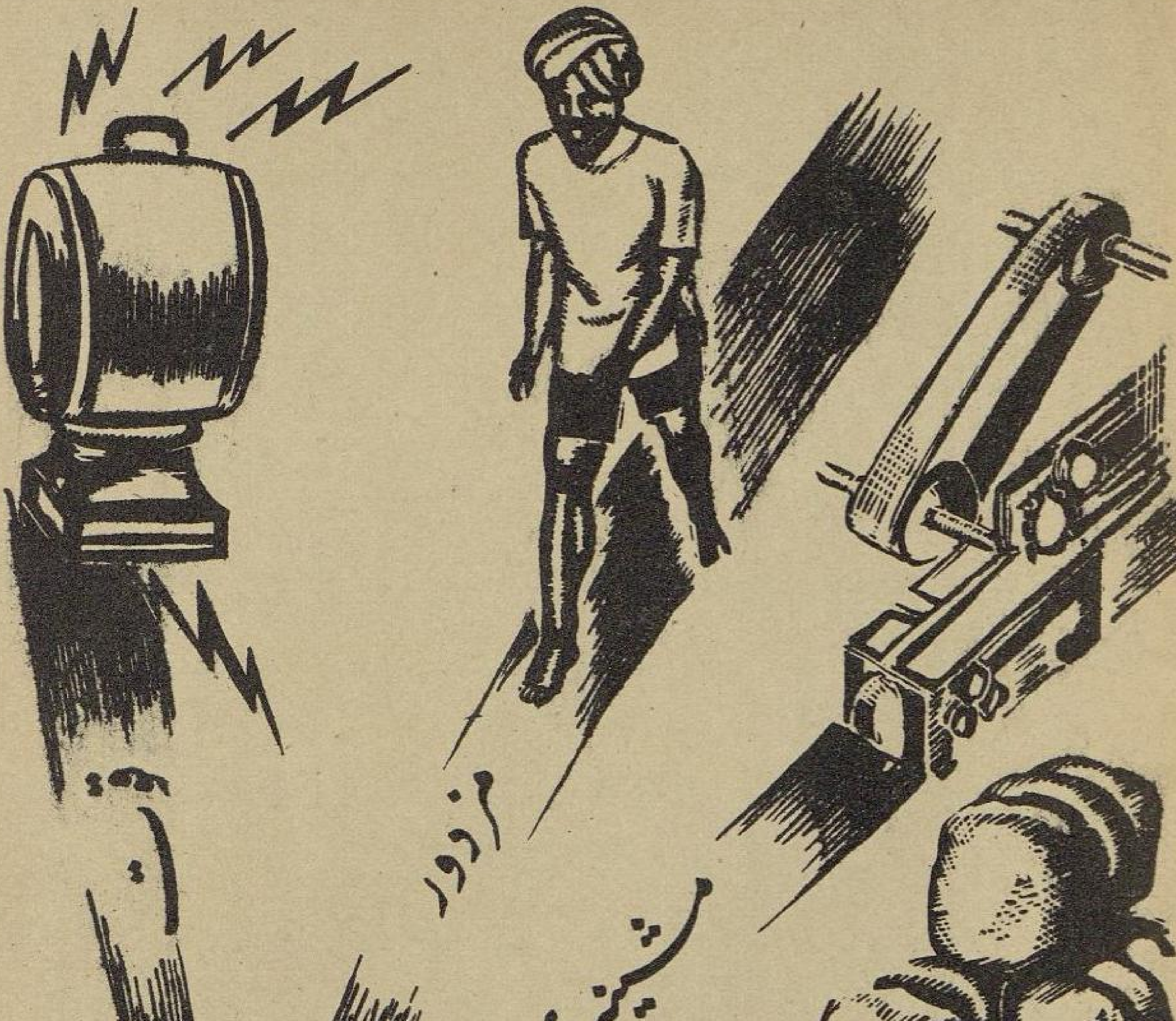


اُس وقت ، ہمارے ہندُستانی کی تصویر تقریباً اِس طرح ہو جائے گی ؛

اِس باب میں ہم نے پارچہ بافی پر غور کیا ہے ، اِس لیے کہ وُہ ہماری سب سے زیادہ قدیم اور سب سے بڑی صنعت ہے۔ اب جو مُشکلات کہ ہمیں اپنے کپڑے بناتے وقت پیش آتی ہیں ، بس اِسی قسم کی مُشکلات ہمیں اُس وقت بھی پیش آتی ہیں جب ہم اپنی ضرُوریات کی دوسری چیزیں تیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں ؛

ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہر بڑے کارخانے کے لیے پانچ باتوں کی ضرُورت ہے ، خواہ اُس کارخانے میں کپڑے تیار کیے جاتے ہوں یا جوُتے ؛ دیا سلائیاں بنائی جاتی ہوں یا موٹریں۔ سب سے پہلے تو ایسے لوگوں کی ضرُورت ہے جو اُس کارخانے کا بنا ہُوا سامان خریدیں ، یعنی سامان کے لیے "منڈی" چاہیے۔ ہندُستان کی بہت بڑی آبادی جنھیں آج کل کی روزمرّہ زندگی کی معمُولی سے معمُولی چیزیں بھی حاصل نہیں ہوتیں دُنیا کی سب سے بڑی منڈیوں میں سے ہے ؛

"خام اشیا" ضروری ہیں ، جن سے سامان تیار کیا جا سکے ہم نے پہلے ہی بیان کر دیا ہے کہ ہمارے پاس تقریباً وُہ تمام خام اشیا موجود ہیں جن کی ہر ایک مُلک کو ضرورت ہے ، اور اُن میں



قوت
مزدور
مشینری
سامان
مانگ

سے اکثر اشیا تو کثرت سے ہیں ؂

پھر ایسے لوگ ضروری ہیں جو کارخانے میں محنت سے کام انجام دیں۔ یعنی "مزدور" یہ ضرورت بھی ہماری گانو کی آبادی پوری کرسکتی ہے جسے صرف اِتنی سی بات کا اِنتظار ہے کہ کب کارخانوں کے دروازے کھُلیں اور کب وہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں اندر داخل ہو جائیں ؂

اب رہیں دو اَور باتیں جو صنعت کو ترقّی دینے کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ اُن میں ایک تو مشینری یعنی "کل" ہے اور دوُسری پاور (Power) یعنی "قوُّت" ہے جس سے اُس کو چلایا جائے کلوں سے چیزیں بہت جلد اور کثرت سے تیار ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ہم نے یہ دیکھا کہ ہمارے کارخانے زیادہ تر مغربی ہند میں واقع ہیں جہاں آبی برقی قوُّت سستی ہے، لیکن اُن میں اکثر کارخانوں کی مشینیں پُرانی اور گھٹیا ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ہندُستان میں مشینری نہیں بناتے بلکہ ہمیں مشینری یورپ اور امریکہ جیسے دوُر دراز مُلکوں سے منگوانی پڑتی ہے جس سے اُس کی قیمت بُہت بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے ہم جدید اور اعلیٰ قِسم کی مشینری خریدنے سے گریز کرتے ہیں اور چار و ناچار اُسی دقیانوسی مشینری سے کام لیتے ہیں ؂

مختصر یہ ہے کہ ہندُستان میں جب تک کارخانے نہ ہوں لوگوں کی ضرورتیں پوُری نہیں ہوسکتیں اور کارخانے مشینری اور قوُّت کے بغیر قائم نہیں کیے جا سکتے۔ اِس لیے آؤ اور ایک چھوٹی سی مہم

پر چلو تاکہ اِس بات کا کھوج لگائیں کہ یہ دونوں جِن کہاں مل سکتے ہیں اور ہم اِن سے کس طرح کام لے سکتے ہیں۔ یہ تُمھارے لیے شاید سنسنی خیز مہم ہوگی۔ اِس لیے کہ تُم کو ایسے مقام پر جانا پڑے گا جہاں مجھے یقین ہے کہ تُم اِس سے پہلے کبھی نہیں گئے۔ یعنی زمین کی تہ میں ٭

ہندستان کے دفینے

اے نگارستانِ عالم نام نامی اِنڈیا
اے بہارِ بے خزاں اے بوستانِ ایشیا
کس قدر افراط سے اللہ نے بخشا تجھے
ابرق و پٹرول و گندگ اور تانبا، کوئلہ
کس کی طاقت ہے کرے لوہے میں تجھ سے ہمسری
تیرا لوہا مانتا ہے آج ہر چھوٹا بڑا
لعل و الماس و زمرد سے ترے دامن ہیں پُر
سیم اور زر کے خزانے تجھ میں ہیں بے اِنتہا
قطرہ قطرہ ہے ترا رشکِ لآلیِ عدن
ذرّہ ذرہ ہے ترا غیرت دہِ لعلِ یمن

(عصمت)

نواں باب

ہمارے دفینے

آجکل لوگ اپنی قیمتی چیزوں کو یا تو فولادی تجوریوں میں بند رکھتے ہیں یا بینکوں کے کمروں میں محفوظ کرا دیتے ہیں۔ اگلے زمانے میں جب کہ تجوریاں اور بینک نہیں تھے تو لوگ اِن چیزوں کو اِس طرح زمین میں دفن کر دیتے تھے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے پاتی تھی اور ضرورت کے وقت اُنھیں چپکے سے کھود کر نکال لیتے تھے۔

جس طرح اِنسان اور کئی باتوں میں بلا جانے بوجھے قدرت کی نقل کرتا ہے، اِس مُعاملے میں بھی اُس نے بالکل ویسا ہی کیا۔ بات یہ ہے کہ انسان کے پیدا ہونے سے بہت پہلے قدرت نے اپنی قیمتی چیزیں زمین کے اندر چھپاکر رکھ دی تھیں ہزاروں سال کے بعد انسان نے اپنی لاعلمی کی تاریکی کے باوجود ایسی چیزوں کو ٹٹولنا شروع کیا جن سے اُسے حیوانوں پر برتری اور فوقیت حاصل ہو سکے۔ جب اُس نے اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیے مارے تو قدرت کے چند چھپے ہوئے خزانوں کا پتا لگا۔ ابتدا میں تو تعجب اور حیرت سے اُس کی آنکھیں چُندھیا گئیں مگر تھوڑے

ہی عرصے میں یکے بعد دیگرے جو کچھ اُس نے پایا اُس کے استعمال کرنے کا طریقہ بھی معلوم کر لیا۔ سونے اور ہیرے جیسی چمکدار اور خوبصورت چیزیں یا لوہے اور کوئلوں کی طرح سیاہ یا پٹرولیم کی طرح سیّال اور بہنے والی؛ ان سب پر اُس نے قابو حاصل کر لیا۔

ایسی چیزیں جن کا شمار نہ تو حیوانات میں ہے اور نہ نباتات میں، عام طور پر "معدنیات" کہلاتی ہیں، اور ان کی جو تہیں یا طبقے زمین کی سطح کے نیچے ہیں انھیں ہم کانیں کہتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے نہایت مُفید ثابت ہوئی ہیں۔ اس لیے کہ اِن میں سے بعض معدنیات سے مشینری تیار کر کے "قوّت" پیدا کی جاتی ہے۔

مگر قُدرت نے اپنی تمام مہربانیاں اور عنایتیں سب کو یکساں اور برابر برابر تقسیم نہیں کی ہیں۔ چنانچہ بعض زمین کے علاقے تو ایسے ہیں کہ وہاں کے لوگ اِن حیرت انگیز قُدرتی خزانوں سے مالا مال ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ جہاں زمین کھودنے پر بھی خاک ہاتھ نہیں آتا۔

بھلا بتاؤ تو کہ ہم زمین کے کِس قسم کے حصّے پر آباد ہیں؟ زمین کا جو حصّہ ہمارے قبضے میں آیا ہے وُہ کچھ بُرا نہیں ہے۔ اِس لیے کہ کوئلے، لوہے اور دُوسری قسم کی دھاتوں سے ہم سالانہ اٹّھائیس کروڑ روپے کما لیتے ہیں اور اس کام میں تین لاکھ پانچ ہزار ہندُستانی لگے ہوئے ہیں۔ مگر سچ پوچھا جائے تو یہ کچھ بھی نہیں ہے! یعنی جو ہمیں کرنا چاہیے تھا ہم اُس کا عُشرِ عشیر بھی نہیں کر

رہے ہیں۔ ہمارے مُلک کی تو یہ کیفیت ہے کہ وُہ اپنے پوشیدہ ذخیروں کی بدولت دُوسرے مُمتاز صنعتی مُلکوں سے ٹکّر کھا سکتا ہے۔ خوش قِسمتی سے ہمیں بیش قیمت خزانے ورثے میں مل گئے ہیں، جن کا اب ہم کھوج لگا کر رہیں گے۔

بہتر ہوگا کہ اِس وقت ہم اپنے پُرانے دوست "کوئلے خاں" سے ابتدا کریں۔ کوئلے کی کان کو انگریز مدفن (cemetery) بھی کہتے ہیں۔ مدفن کے معنی تو تُم جانتے ہی ہو۔ ایسے مُقام کو کہتے ہیں جہاں مُردے دفنائے جائیں۔ مگر سُوال یہ ہے کہ کان میں کیا چیز دفن ہے؟



اِس وقت تو اِس میں کوئلہ ہی کوئلہ ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ پہلے وہاں کوئلہ نہیں تھا بلکہ آج سے ہزارہا سال پہلے دلدلوں کی گھاس، طرح طرح کے پودے اور بعض جگہ جنگل کے جنگل دفن ہوگئے پھر سیکڑوں سال تک وُہ وہیں ریت، کالی مٹّی اور پتھّروں میں دبے ہوئے سڑتے گلتے رہے اور مُختلف اثرات سے سیاہ اور سخت ہوگئے۔ جب ہمیں اُن کا پتا چلا اور جب ہم نے کھود کر دیکھا تو اُن کو کوئلے کی طرح پایا؛ اِس لیے ہم نے اُس چیز کا نام کوئلہ رکھ دِیا۔

بعض اوقات کوئلے کو "کالا ہیرا" بھی کہتے ہیں۔ اچھا، ذرا یہ

تو بتاؤ کہ ایسی معمولی چیز کو ایسے نادر اور قیمتی پتھر سے کیوں تشبیہ دی گئی ؟ بھلا کہاں کوئلہ اور کہاں ہیرا ! یہ سچ ہے کہ دونوں میں کوئی نسبت نہیں ہے مگر اِس تشبیہ کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہ دونوں "کاربن" سے بنے ہیں اور دُوسری وجہ یہ ہے کہ کوئلہ ہیرے سے کہیں زیادہ قیمتی ہے ! کیونکہ اس سے کئی عجیب و غریب کام لیے جا سکتے ہیں ؛



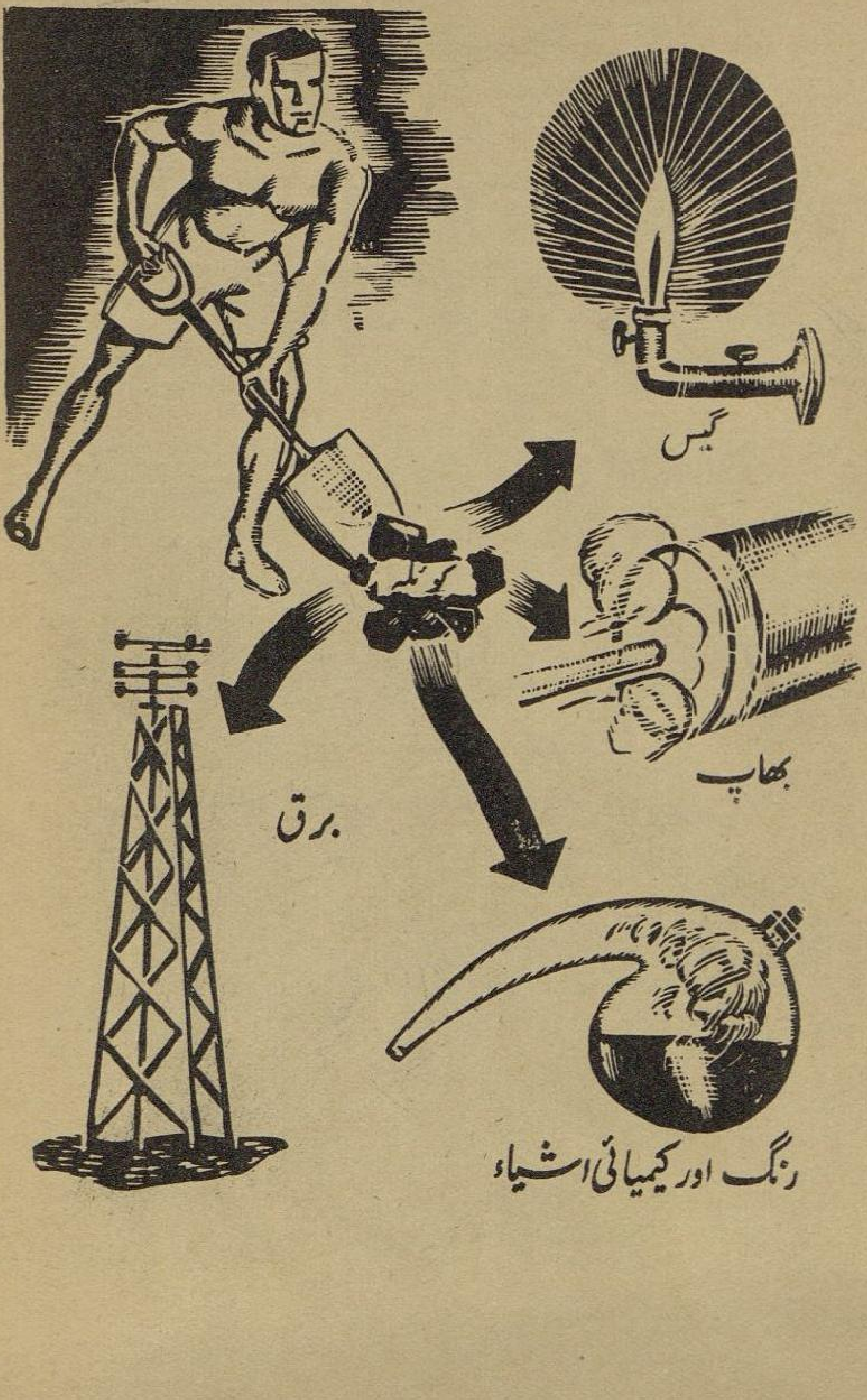
کوئلے کا استعمال پہلے پہل ایندھن کے طور پر کیا جاتا تھا اور ایندھن وُہ چیز ہے جسے آپ جلاکر آگ اور گرمی حاصل کرتے ہیں۔ کوئلے کا ایندھن لکڑی کے ایندھن سے بہتر ثابت ہُوا ، اِس لیے لوگ اِسی کو جلانے لگے۔ پھر "گیس" اور "برق" یعنی بجلی کی دریافت ہوئی اور لوگ کوئلے کے بجائے اِن کو پکانے اور گرمی حاصل کرنے کے لیے عام طور سے استعمال کرنے لگے۔ کچھ زمانے کے بعد کوئلے سے دو اَور زیادہ اہم کام لیے جانے لگے ؛ یعنی اُس سے دو چیزیں بنائی جانے لگیں۔ ایک تو بھاپ اور دُوسری برقی قوّت ؛

آگے چل کر دیکھوگے کہ آج کل کوئلے سے کیا کیا کام لیے

جا رہے ہیں۔ اگر زمانے کی یہی رفتار رہی تو یقین جانیے کہ کچھ عرصے کے بعد بھاپ اور بجلی حاصل کرنے کے لیے کوئی دُوسری چیز استعمال ہونے لگے گی اور کوئلے سے کوئی اَور ہی کام لیا جائے گا۔

چنانچہ گزشتہ چند سال میں یہ ثابت ہوگیا کہ کوئلے سے چند اَور عجیب و غریب چیزیں حاصل کی جاسکتی ہیں؛ مثلاً کول تار (coal-tar) جو رنگ بنانے میں کام آتا ہے یا ادویات یا اَور دُوسری کیمیاوی اشیاء جو نہایت اہم ہیں۔ اس قسم کے رنگ اور دوائیں ہم دُوسرے مُلکوں سے ہر سال کوئی چار کروڑ روپیوں کی خریدتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں کول تار سے بنائی جاتی ہیں اور کول تار صوبہ بنگال اور بہار میں کثرت سے بنایا جاتا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ضائع کر دیا جاتا ہے۔ جھریا کی کوئلے کی کانوں میں تقریباً تین کروڑ گیلن کول تار، جس میں موٹر اِسپرٹ اور ہلکے تیلوں کی بہت سی مقدار موجود رہتی ہے، ہر سال برباد جاتا ہے!

کیمیائی اجزا اور رنگ کے مسالوں کی ہر زمانے میں ضرورت ہوتی ہے خواہ وہ امن کا زمانہ ہو یا جنگ کا۔ ۱۹۱۴ء میں جب جنگ چھڑی تو اِنگلستان میں نوّے فیصدی جرمنی کے رنگ استعمال کیے جاتے تھے۔ اُس وقت انگریزوں کے کان کھڑے ہوئے کہ ایسی اہم چیز کے لیے دُوسرے مُلکوں کے دستِ نگر رہنا کتنی بڑی نادانی ہے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ۱۹۳۹ء میں جب دوبارہ لڑائی چھڑی تو اِنگلستان میں صرف دس فیصدی رنگ باہر سے آتے تھے اور نوّے فیصدی وُہ خود اپنے مُلک میں تیّار کرتے تھے۔ اگر انگریز یہ چند


گیس
بھاپ
برق
رنگ اور کیمیائی اشیاء

سال میں کرنے لگے تو پھر ہم بھی یقیناً ایسا ہی کر سکتے ہیں۔ اِس کام کے لیے ہمیں فوراً کمر باندھ کر کھڑے ہو جانا چاہیے۔ ذرا سوچو تو کہ ہمارے مُلک میں بیماریوں کی کِس قدر کثرت ہے اور اُن سے بچنے کے لیے کِتنی دواؤں کی ضرورت ہے۔ ہمارے مُلک میں کِتنا کپڑا تیّار کیا جاتا ہے جس کے رنگنے کے لیے ہمیں کِس قدر رنگوں کی حاجت ہے! واقعہ یہ ہے کہ لوگوں نے بار بار ہمیں یہ بتایا ہے کہ رنگ اور دوائیں تیّار کرنے کے لیے کوئلہ ایک بیش بہا چیز ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہم اِنجنوں، آتش دانوں اور باورچی خانوں میں کوئلہ کو بھک بھک جلا کر برباد کیے جا رہے ہیں؟



یہ قیمتی معدنی شے ہمارے پاس کِتنی مقدار میں ہے؟ کوئلہ پیدا کرنے والے مُلکوں میں ہمارے مُلک کو ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔ اور اُس لحاظ سے ہمارا درجہ نواں ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں ایک لاکھ باسٹھ ہزار آدمی دو کروڑ اسّی لاکھ ٹن کے قریب ہر سال کوئلہ نکالتے ہیں جس میں سے ۹/۱۰ حصّہ بنگال اور بہار کی کانوں

سے برآمد ہوتا ہے۔ سچ پوچھو تو کانوں کے لحاظ سے یہ دونوں صوبے بڑے خُوش قسمت ہیں جس کا تذکرہ ہم آگے چل کر کریں گے۔

کوئلے کی جو مقدار اب ہم حاصل کر رہے ہیں وہ اُس مقدار کے مقابلے میں جو اِس وقت کانوں میں دبی پڑی ہے اور جسے ہم نے ہاتھ تک نہیں لگایا ہے کچھ نہیں ہے۔ چنانچہ اِس قِسم کی کانوں کی ایک بہت بڑی تعداد جنوب میں دکن کی پہاڑیوں میں چھپی ہوئی ہے اور حال ہی میں کشمیر کی ریاست میں شمالی سرحد پر ایک کوئلے کی کان برآمد ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں ساٹھ ارب ٹن کوئلہ زمین کے اندر موجود ہے۔ اِس کا



مطلب یہ ہے کہ جس رفتار سے ہم اب کوئلہ نکال رہے ہیں اگر اُسی رفتار سے نکالتے رہیں تو ہم یہ تمام کوئلہ دو ہزار سال سے زیادہ مُدّت تک نکالتے رہیں گے۔

اس کے علاوہ ہمارے ہاں کوئلے کی طرح بعض اہم اور مُختلف کچ دھاتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ کچ دھات کیا ہے؟ یہ ایک قدرتی

معدنی شے ہے جس میں کچھ دھات شامل ہوتی ہے۔ اِس دھات کو کچ دھات سے حاصل کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ پہلے کچ دھات کو گرم کر کے پگھلاتے ہیں اور پھر اُس سے دھات جُدا کرتے ہیں۔ مُختلف کچ دھاتوں میں مُختلف قِسم کی دھاتیں ہوتی ہیں؛ مثلاً لوہا، مینگنیز اور کروما ئیٹ وغیرہ۔ یہ دھاتیں بڑی کارآمد ہیں اور ان سب سے مشینیں بنائی جاتی ہیں۔

اِن میں سے لوہے کی کچ دھات کی ہم کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اِس ملواں دھات سے لوہا بناتے ہیں، اور لوہے سے پھر فولاد تیار کرتے ہیں۔ اب اِس لوہے اور فولاد سے جو جو حیرت انگیز کام لیے جاتے ہیں اُن کا ذِکر ہم بعد میں کریں گے۔ مگر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ موجُودہ دور میں وُہ مُلک کبھی ترقی نہیں کر سکتا جہاں لوہا اور فولاد نہ ہو۔

کوئلے کی طرح لوہا بھی زیادہ تر بہار اور بنگال میں نکالا جاتا ہے۔ جس طرح اِس وقت ہم کوئلہ ایک محدود رقبے سے حاصل کر رہے ہیں اُسی طرح لوہا بھی ایک معمُولی رقبے سے نکال رہے ہیں۔ ہمارے ہاں لوہا کثرت سے ہے۔ چنانچہ شمالی ہند اور وسطی ہند میں لوہے کے خزانے موجُود ہیں جو دُنیا بھر میں سب سے بڑے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اُن میں کوئی تین ارب ٹن لوہا موجُود ہے۔ اِس طرح ہماری لوہے کی کانیں دُنیا کی بڑی سے بڑی کانوں سے رقبے ہی کے لحاظ سے مقابلہ نہیں کرتیں بلکہ یہ اوصاف کے لحاظ سے بھی بڑھ چڑھ کر ہیں۔ پھر بڑی خوبی کی بات یہ ہے

کہ ہمارے ہاں بعض جگہ کا لوہا تو ایسا لاجواب اور بے نظیر ہے کہ دُنیا اُس کا لوہا مان رہی ہے۔ اِس قدر ذخیرہ ہونے کے باوجود ہم دوسرے مُلکوں کے مقابلے میں بہت کم لوہا نکال رہے ہیں۔ اِس بات کا اندازہ تمھیں اُس تصویر کے دیکھنے سے ہوگا جو ہم نے صفحہ ۲۸ پر دی ہے۔ اِس لحاظ سے دُنیا میں ہمارا درجہ ساتواں ہے۔ اگرچہ ہم کو اوّل ہونا چاہیے تھا۔

دُوسری اہم چیز مینگنیز ہے، جس کا ہم ابھی ذکر کریں گے۔ مینگنیز کچ دھات دُنیا میں سب سے زیادہ رُوس میں پیدا ہوتی ہے اور اُس کے بعد ہمارا نمبر ہے۔ مگر سچ پُوچھو تو ہمارے پاس اس کا "جتنا ذخیرہ ہے" وہ تمام روئے زمین پر بھی نہیں ہے۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں ہم نے کچ دھات سے چار لاکھ بانوے ہزار ٹن مینگنیز نکالا جس میں سے آدھے سے زیادہ مقدار صوبجات متوسط سے حاصل ہوئی۔ صفحہ ۲۹ پر تصویر دیکھوگے تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ اِس کی دُنیا کی پیداوار میں دنیا کا کونسا حصہ ہے۔

مگر ہم اس سے کیا کام لیتے ہیں؟ کیا ہم اُس کچ دھات سے مینگنیز نکالتے ہیں اور کیا ہم اُسے لوہے میں ملاکر بہترین قسم کا فولاد تیّار کرتے ہیں؟ یا کیا ہم اُس کا سُفوف بناتے ہیں اور اُس سُفوف سے چیزوں کا رنگ کاٹتے ہیں؛ یعنی اُن کا رنگ سفید کرتے ہیں؟ کیا ہم اُس سے زوردار سٹرانگ (strong) ڈس انفیکٹنٹ (disinfectant) تیّار کرتے ہیں؟ یا کیا ہم اس سے شیشوں کو رنگین بناتے ہیں؟ کر تو سب کچھ سکتے ہیں مگر فی الحال کر کچھ

بھی نہیں رہے ہیں بلکہ یہ تمام کاروبار، ہم نے دُوسروں پر چھوڑ دیا ہے! ہم تو بس اِتنا کرتے ہیں کہ کچ دھات کھودتے ہیں اور اُسے جہاز میں بھر کر یُورپ، امریکہ اور جاپان روانہ کر دیتے ہیں۔ پھر طُرّہ یہ ہے کہ ہر سال اُس کی برآمد میں اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء میں ہم نے جو مقدار باہر روانہ کی تھی، اب اُس سے پندرہ گُنا زیادہ روانہ کر رہے ہیں۔

ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہم اپنے اکثر حیرت انگیز خزانوں کے ساتھ یہی سلوک کر رہے ہیں۔ جن چیزوں کی دُوسرے مُلکوں کو ضرورت نہیں ہم اُن کو ہاتھ تک نہیں لگاتے اور جن چیزوں کی اُنھیں ضرورت ہے، اُنھیں ہم دھڑا دھڑ بیچتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ اُس سے بھی زیادہ اندیشہ ناک ہے۔ اِس لیے کہ آیندہ جب ہم میں عقل آئے گی اور ہم اُن چیزوں کو استعمال کرنے کے قابل ہوں گے تو ہمارے پاس کُچھ نہیں رہے گا! پھر بے وقوفی پر بے وقوفی یہ ہے کہ ہم اُن چیزوں کو دُوسروں کے ہاتھ آدھی قیمت پر فروخت کر رہے ہیں!

مثلاً اگر ہم مینگنیز کو کچ دھات سے علیحدہ کر کے سمندر پار روانہ کرتے تو ہمیں لنڈن اور نیویارک میں اُس کی اچھّی خاصی قیمت مل جاتی۔ برخلاف اِس کے ہم کچ دھات روانہ کر رہے ہیں جس میں اصل دھات کے ساتھ بہُت سی بیکار چیزوں کے بھی اخراجات ادا کرنے پڑتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم بہُت سُست اور نکمّے ہیں۔ ہم ہندُستان میں ایک بھی ایسا کارخانہ قائم نہ کر سکے جس میں

کم سے کم دھات کو کچ دھات ہی سے جُدا کرنے کا انتظام ہوتا۔ اب جو مینگنیز کی حالت ہے وہی دُوسری کچ دھاتوں کا بھی حال ہے ٭

ابرق (mica) ایک اَور معدنی چیز ہے جو ہمارے ہاں کثرت سے پیدا ہوتی ہے دُنیا میں اِس کے جو خزانے موجود ہیں، اُن سب سے بہتر ہمارے ہاں کے خزانے ہیں۔ یہ جنگ میں بہت کارآمد ثابت ہوئی ہے۔ اِس سے برقی رَو کی حفاظت کا کام بھی لیا جاتا ہے اور یہ ہمیں اُس کے دھکّے سے محفوظ رکھتی ہے اور بعض اوقات اُسے شیشے کی جگہ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ہم نے ابرق کی بہت سی کانوں کو چھوا تک بھی نہیں ہے، اِس پر بھی جو مقدار کہ اب دُنیا میں پیدا ہو رہی ہے اُس کی دوتہائی کے قریب ہمارے ہاں سے نکلتی ہے اور یہ بھی بہار ہی میں پائی جاتی ہے۔ لیکن جس طرح دُوسری چیزوں کو ہم سمندر پار روانہ کر رہے ہیں اُسی طرح یہ بھی امریکہ اور انگلستان روانہ کر دی جاتی ہے ٭

اِن کے علاوہ دُوسری اَور دھاتیں بھی ہیں مگر اُن کی مقدار کم ہے۔ اُن میں ایک تو تانبا ہے جس کے تار بنا کر شہروں میں بجلی دوڑائی جاتی ہے؛ دُوسرا ٹین یا قلعی ہے جس کے ڈبّوں میں بسکٹ میوے اور دُوسری مزیدار چیزیں بھر بھر کر ہم تک پہنچائی جاتی ہیں؛ تیسرے ایلومینیم ہے جو ہلکا اور پائیدار ہوتا ہے اِس لیے اُس کے کھانا پکانے کے برتن بناتے ہیں، بجلی کا سامان تیار

کرتے ہیں اور ہوائی جہاز وغیرہ بناتے ہیں؛ چوتھا کروماٹ ہے جس کی اینٹیں فولاد کی بھٹیوں کے اندرونی حصوں میں لگاتے ہیں اور پانچویں اور چھٹی دھات سونا اور چاندی ہے جن کے سکے بنائے جاتے ہیں۔ اِن کے علاوہ ہماری جنوبی سرحد؛ یعنی راس کماری کی ریت میں (ilmenite) پایا جاتا ہے جس سے ہم روغن سازی کا سامان تیار کرتے ہیں اور مونیزائٹ (monazite) ملتا ہے جس سے لیمپ کے مینٹل بناتے ہیں۔ اِس باب کے صفحہ ۱۴۸، ۱۴۹ تصویر میں تم بعض سامان دیکھ سکتے ہو جو ہماری معدنیات سے تیار کیے جاتے ہیں ٭

مگر تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ تمام معدنیات، دھات ہی ہوتے ہیں۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ زمین میں مختلف قسم کے کھاد بھی ہوتے ہیں؛ جیسے شورہ۔ یہ بھی زیادہ تر بہار ہی میں پایا جاتا ہے اِس میں نائٹریٹس ملے ہوتے ہیں جس سے اگلے زمانے میں بارود اور اسی قسم کے دھماکہ پیدا کرنے والے مادّے تیار کرتے تھے۔ مگر آجکل مصنوعی نائٹریٹس استعمال کیے جاتے ہیں۔ اِس سے بڑا فائدہ یہ ہُوا کہ شورے کو ہم دوبارہ زمین میں ملا کر کھاد کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں کہیں تم یہ نہ بھُول جانا کہ زمین کو نائٹروجن کی ضرورت ہے۔ ہماری زمین میں تھوڑے بہت فاسفیٹس بھی ہیں۔ کاش یہ ہمارے پاس زیادہ مقدار میں ہوتے تاکہ اِن سے عمدہ کھاد تیار کیا جا سکتا ٭

معمولی نمک ہم جتنا چاہیں سمندر کے پانی سے بنا سکتے ہیں؛ یہ اُن کیمیاوی اشیا کے بنانے کے لیے بڑی اہم چیز ہے جو قلی

(alkalis) کہلاتے ہیں اور یہ "صنعت کے لیے بُنیادی چیز ہیں"۔ یہ ہماری تمام قسم کی روزمرہ کے استعمال کی چیزوں؛ مثلاً کاغذ، چمڑا، شیشہ، صابُون اور کئی چیزوں کے بنانے میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء تک اِن چیزوں کو بیرونی ممالک سے خریدنے میں ہمیں ایک کروڑ روپے صرف کرنے پڑے تھے۔

مگر اب ہم آگے ایک زبردست قدم اُٹھا رہے ہیں۔ بیٹھاپور بڑودے کی ریاست کا ایک مشہور شہر ہے جسے "نمک نگر" کہا جا سکتا ہے وہاں نمک اور چُونے کے پتھر کثرت سے موجود ہیں۔ اب اُن سے چند مہینوں کے بعد سوڈے کی راکھ، کاسٹک سوڈا، رنگ کٹ سفوف اور دُوسری کیمیائی اشیا بڑی مقدار میں تیار ہونے لگیں گی۔

اِن کے علاوہ ہمارے ہاں وُہ حیرت انگیز معدنی سیّال بھی ہے جسے پٹرول یا پٹرولیم کہتے ہیں۔ یہ قوّت پیدا کرنے کا اِس قدر زبردست ذریعہ ہے کہ اِس کے چشموں پر قبضہ کرنے کے لیے مُلک آپس میں لڑ مرتے ہیں۔ برما میں پٹرول کثرت سے ہے مگر افسوس



کہ وُہ صوبہ ہندُستان سے جُدا کر دِیا گیا! یہ آسام میں تھوڑا بہت پایا جاتا ہے، لیکن کہا جاتا ہے کہ اِس کے چشمے بلوچستان اور پنجاب میں بھی ہیں۔ پنجاب میں شہر جہلم کے پاس بڑے بڑے تیل کے خزانے دریافت ہُوئے ہیں اور یہ برابر کشمیر تک چلے گئے ہیں۔ شُکر ہے کہ وہاں کام شُروع کر دِیا گیا ہے۔ اُن کا محلِ وقوع قُدرتاً بہُت عُمدہ ہے۔ یہاں ریل بھی موجُود ہے اور ایک بڑی سڑک "گرانڈ ٹرنک روڈ" یہاں سے گزرتی ہے۔ اِس لیے یہاں سے تیل ہندُستان کے مُختلف حِصّوں میں آسانی سے پہنچایا جا سکتا ہے۔

گندک کا نام لینا تو میں بھُول ہی گیا۔ یہ دھات معدنی اور کیمیائی صنعتوں کی کُنجی ہے۔ اِس کے دو چار فائدے تمھیں

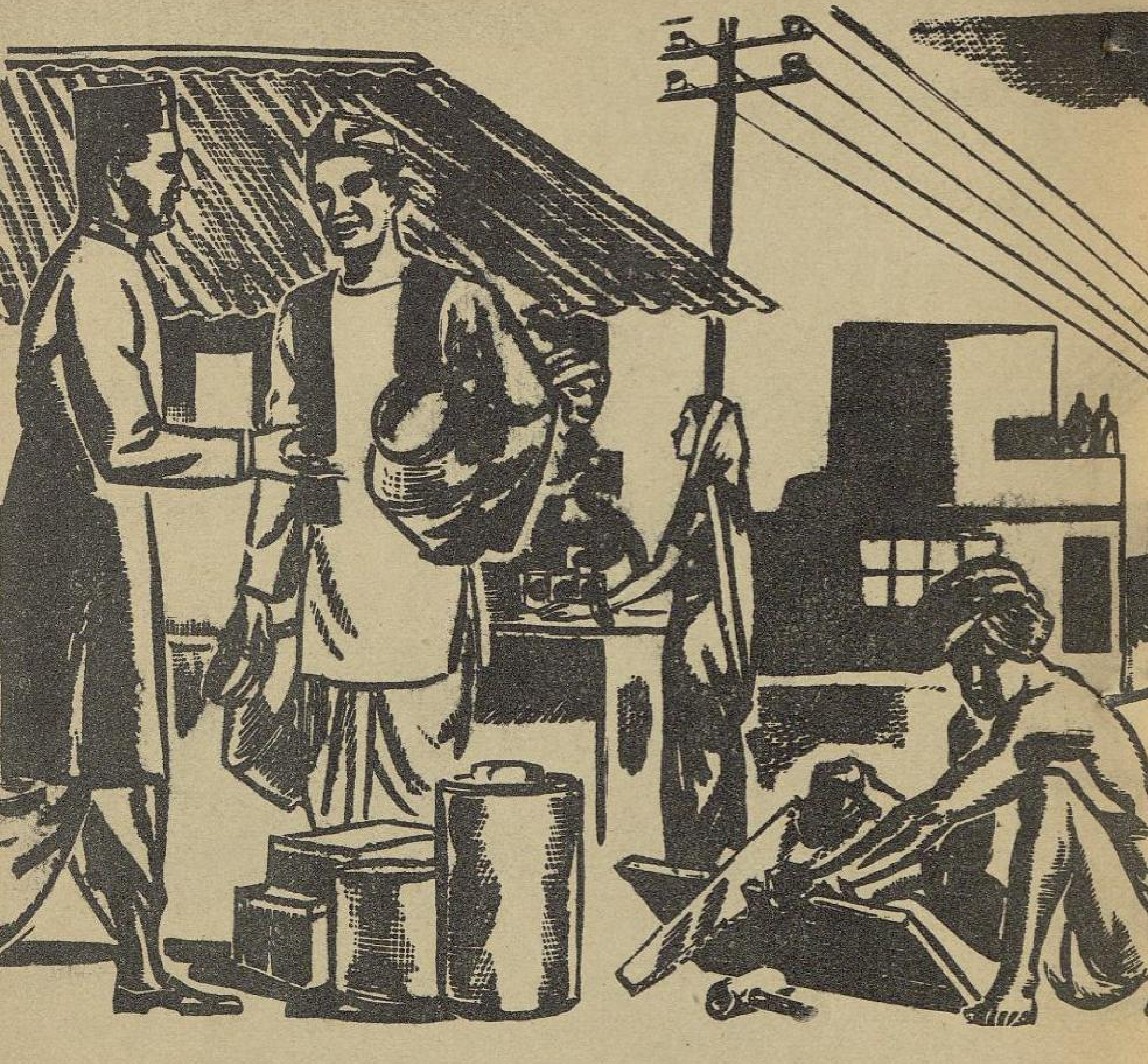
دُنیا میں اگر پُوچھو تو ہیں سیکڑوں چیزیں — ہیں بیش بہا اور اہم اُن میں مگر تین
ان تینوں میں پہلے تو بڑا سب سے ہے پٹرول — لڑمرتے ہیں اس کے لیے آپس میں سلاطین
ڈرتے ہیں مسولینی و ہٹلر بھی اسی سے — دبتا ہے کسی سے تو اسی سے ہے سٹالین
پٹرول کے بعد آتی ہے بارُود کی باری — ابلیس نے جاری کیے ہیں جس کے فرامین
بجھ جائے سرنگ اُس کی تو اُڑ جاتے ہیں بھک سے — ارضِ حبش و مصر و خطا و ختن و چین
ہے تیسری وُہ دھات جسے کہتے ہیں لوہا — ملتے ہوئے دونوں سے ہیں اُس کے بھی قوانین
بنتے ہیں اسی دھات سے توپ اور دبابے — شمشیر و سناں تیر و تفنگ اور قرابین
قبضے میں کسی کے اگر آجائیں یہ چیزیں — ہے مُلک تو کیا چیز وُہ دنیا کو بھی لے چھین

(تصرف بہ نظم مولانا ظفر علی خان)

(عصمت)



بتاتا ہوں۔ یہ بڑی زبردست سڑاندروک (disinfectant) ہے؛ جِلدی بیماریوں کے علاج کے لیے اِستعمال کی جاتی ہے؛ اِس سے ربر کو مضبوط اور پائیدار بناتے ہیں اور کِسان اپنے کھیتوں کے کیڑے مارتے ہیں۔ اِس کے عِلاوہ کاغذ اور لکڑی کا تیّار کیا ہُوا سامان



سیّال گندک (liquid sulphur) میں تر کرتے ہیں جس سے اُن میں مضبوطی اور پائیداری پیدا ہوتی ہے ؛ اُسے تیل میں ملا کر دھاتوں کو کاٹتے ہیں اور مکانات تعمیر کرتے وقت، دھات کو پتھّر میں پیوست کرنے کے لیے اِس کو سیمنٹ میں ملا دیتے

میں - یہ زنگ کاٹ بھی ہے ؛ چنانچہ گھاس اور بید کے سامان کا رنگ اِس کے ذریعے سے سفید کرتے ہیں اور چمڑے کو رنگنے کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے - اِس کے علاوہ کیمیائی اشیا تیّار کرنے کے لیے بھی یہ بہت اہم ہے ؂



گندک قدرتی حالت میں پیریٹس (pyrites) کی شکل میں پائی جاتی ہے اور تقریباً ہندوستان کے ہر حصّے میں ہوتی ہے مگر اِتنی کافی مقدار نہیں ہے کہ اُس سے سلفورک ایسڈ تیار کرسکیں یہ کتنی افسوس ناک بات ہے ! انگلستان نے سستے قسم کا سلفورک ایسڈ بنایا اور اُس کی قیمت چند سال کے اندر تیس پونڈ

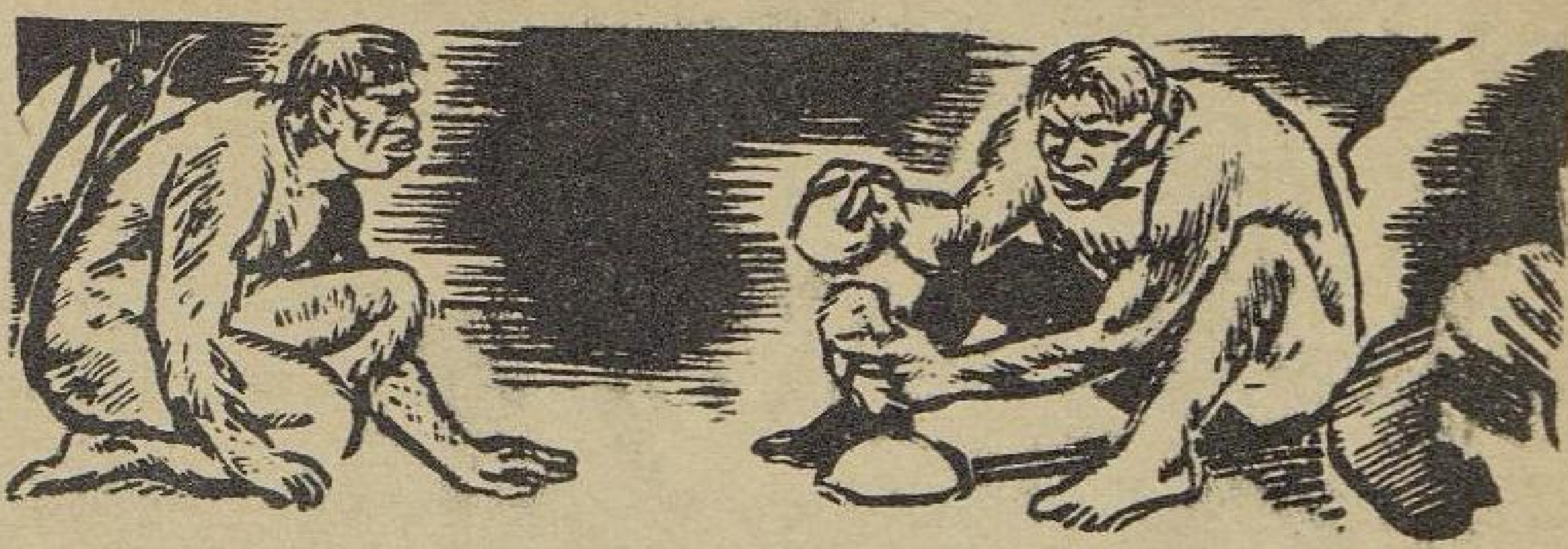
فی ٹن سے گر کر دو پونڈ فی ٹن تک آ گئی۔ اِس مُلک کی تمام کیمیائی صنعتوں کا دارومدار اسی سستے سلفورک ایسڈ پر ہے۔ اب کیمیائی مصنوعات اور انگریزی ادویات نے ہندُستان پر دھاوا بول دیا۔ جس سے ہماری پھٹکری اور شورے کی رہی سہی پیداوار بھی برباد ہو گئی۔ یہی سبب ہے کہ اب ہم یوُرپ سے دو کروڑ پونڈ قیمت کی اُن معدنیات کی بنی ہوئی اشیا خرید رہے ہیں جو خود ہمارے ہندُستان میں موجود ہیں لیکن بے کار پڑی خراب ہو رہی ہیں"۔

اب تم نے دیکھ لیا کہ ہم کِس طرح معدنیات سے مالا مال ہیں اور خاص کر لوہے، مینگنیز اور ابرق میں تو ہمارا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا مگر پٹرول اور گندک کے مُعاملے میں ہم تنگ دست ہیں۔ مگر ایک اِنسان کے قبضے میں "ہر چیز" نہیں ہو سکتی۔ کیوں، یہ سچ ہے نا؟ اِس کے یہ معنی ہوئے کہ ہم اپنی موجودہ برآمد کی مقدار میں کوئی اضافے کی ترکیب سوچیں؛ مثلاً اِطلاع ملی ہے کہ شملہ میں اور بہار کے ضلع شاہ آباد میں اور بمبئی کے ضلع رتنا گیری میں پیریٹس (pyrites) دریافت ہوئی ہے۔ اب اِس سے زیادہ اور کیا چاہتے ہو؟ کہتے ہیں کہ بہار میں تانبے کی تیاری میں کچھ دھات گرم کرتے وقت بیس ٹن سلفر ڈائی آکسائڈ گیس روزانہ ہوا میں برباد ہوتی رہتی ہے۔ دوسرے مُلکوں میں بھلا مجال ہے کہ یہ اس طرح ضائع جائے۔ کینیڈا اور فن لینڈ میں تو اِسے گندک میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ کیا ہم بھی یہی نہیں کر سکتے؟

اِس کے علاوہ کیا ہمیں یہ معلوم ہے کہ ہماری زمین کی تہ

میں کیا کیا چیزیں دبی ہوئی ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ ہم اِس قدر کاہل واقع ہوئے ہیں کہ کبھی ہم نے یہ پتا چلانے کی "تکلیف ہی گوارا نہیں کی کہ ہمارے خزانوں میں کیا کیا چیزیں چھُپی ہوئی ہیں۔ ہاں چند سرکاری عہدے دار اِس کام پر مقرر ہیں۔ وُہ زمین کھود کر یہ کھوج لگانے رہتے ہیں کہ ہمارے مُلک میں کیا کیا چیزیں دبی ہوئی ہیں۔ وُہ ہر سال اِس مُہم پر ایک خاص ضلع کی طرف نکلتے ہیں مگر اُن کی تعداد اِس قدر کم ہے کہ وُہ اب تک ہمارے مُلک کے ایک چھوٹے سے حِصّے ہی کا معائنہ کر سکے ہیں۔ مُلک کے باقی حِصّوں میں جو خزانے موجُود ہیں اُن کا کچھ پتا نہ چل سکا۔

اگر تم اخبار کا مطالعہ کرتے رہتے ہو تو ایک روز تم دفعتہً پڑھوگے کہ آٹھ کروڑ ٹن کوئلہ اور اکسٹھ کروڑ ٹن لوہے کی کچ دھات آسام میں دریافت ہوئی۔ دُوسرے روز خبر ملے گی کہ میگنے ٹائٹ (magnetite) یعنی مقناطیس کی کچ دھات (magnetic iron ore) کی ایک بہُت بڑی مقدار کا پتا بہار کے ضلع دولت گنج میں لگا ہے۔ یہ بڑی کارآمد چیز ہے۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معدنیات کے لحاظ سے صُوبۂ بہار بہُت ہی خوش قِسمت ہے۔



دسواں باب

قوّت

بہت ہی قدیم زمانے میں جب کہ آدمی وحشی تھا تو وہ اپنے کام کاج حیوانوں ہی کی طرح اپنے ہاتھوں سے انجام دیتا تھا۔ لیکن کچھ عرصے بعد ہی۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ چند سو صدیوں کے بعد! اُس نے لکڑی، پتھر اور دھات وغیرہ سے بھدّے قسم کے آلات بنائے تاکہ وہ اُن کی مدد سے چیزوں کو کاٹ سکے، توڑ سکے اور اُٹھا سکے۔ لیکن اِن آلات کے استعمال کے لیے اُسے اپنے ہاتھ پاؤں سے کام لینا پڑتا تھا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد اُسے پتا چل گیا کہ بعض کام جانوروں سے بھی لیے جا سکتے ہیں۔ اِس لیے اُس نے ہاتھی، گھوڑے اور بیل وغیرہ پالے اور اُن سے، اپنا مشکل سے مشکل کام لینا شروع کر دیا۔ اِس کے بعد اُس نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہ اپنی کشتی یا جہاز کو ہوا کی طاقت، دریا کی رَو اور سمندر کے اُتار چڑھاؤ سے بھی چلا سکتا ہے۔ لیکن وہ دوسرے

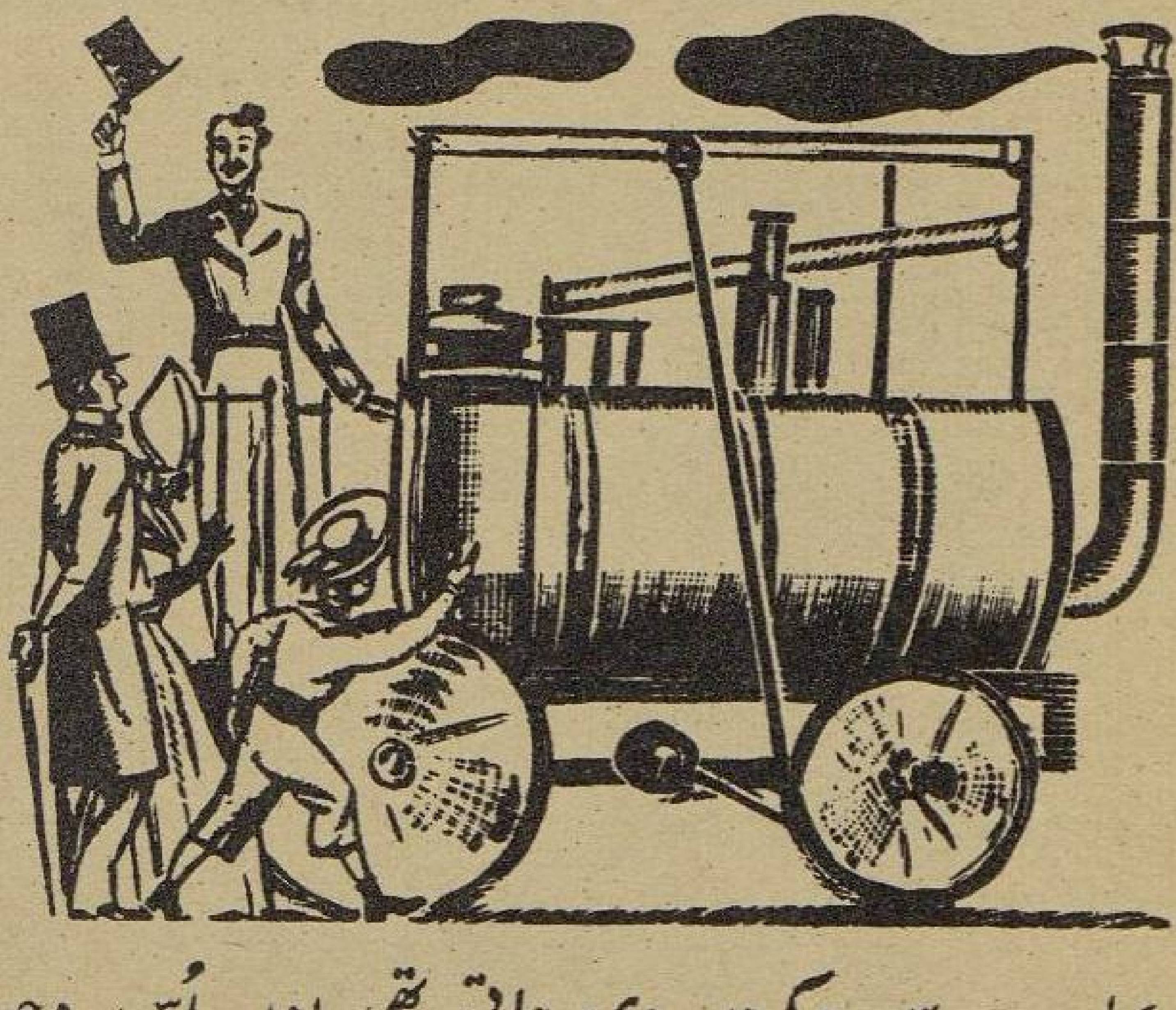
چھوٹے موٹے مشقت کے کام؛ جیسے پتھر توڑنے یا درخت کاٹنے یا حمالی کے کام جانوروں یا غلاموں سے لیتا تھا۔ یہ کام کا طریقہ کئی ہزار سال تک جاری رہا۔

آج سے سو سال پہلے تک ہندستان میں لوگ مکان بنانے، کشتی چلانے اور سامان لانے لے جانے کے لیے بالکل وہی طریقے استعمال کرتے تھے جو کہ آج سے ہزاروں سال پہلے ہمارے آبا و اجداد کے تھے یعنی جب کہ وہ ہندستان میں آکر بسے تھے۔ ۱۸۰۰ء میں پٹنے سے دہلی جانے کے لیے جو وقت لگتا تھا وہ اتنا ہی ہوتا تھا جتنا کہ اشوک یا چندر گپت کے زمانے میں۔

ایک عرصے تک مختلف ممالک کے عالم کسی ایسی قوت کی تلاش میں لگے ہوئے تھے جو ہر قسم کے آلات کو چلا سکے؛ یعنی "صدر محرک" (Prime Mover) ہو۔ انسان کسی ایسی چیز کی جستجو میں بھی رہا جو اس کے معمولی کاروبار اور نقل و حمل کے آلات اور جنگ کے ہتھیاروں کو اسی طرح قوت پہنچائے جس طرح کہ خود اس کو غذا قوت پہنچاتی رہتی ہے۔ غذا کیا ہے؟ غذا توانائی (energy) کی ایک مقدار (amount) ہے جو آدمی کے دل و دماغ، اس کے جسم اور اس کے ہاتھ پانو کو قوت پہنچاتی ہے۔ اگر اس قسم کی کوئی قوت دریافت ہوگئی تو وہ انسان کو زیادہ محنت اور مشقت کرنے سے بچا دے گی؛ اس قسم کی قوت دریافت کرنے والوں میں ایک شخص لیونارڈو ڈا ونسی (Leonardo da Vinci) نامی بھی تھا جو پندرھویں صدی میں اٹلی کا ایک بہترین مصور مانا جاتا تھا۔

سولھویں اور سترھویں صدی میں بھی قابل آدمی برابر اُس قوّت کے پتا چلانے میں لگے رہے اور جتنا جتنا زمانہ گزرتا گیا اُتنا ہی اُن لوگوں کی کوششوں میں اضافہ ہوتا گیا ۔

آخرکار ۱۷۶۸ء میں بھاپ انجن (steam engine) دریافت ہُوا۔ یہ پتا چل گیا کہ اگر پانی کو خُوب جوش دیا جائے اور بھاپ (steam) کو اُستوانے میں بھر کر بند کر دیا جائے تو اُس میں چیزوں کو حرکت دینے کی قُوّت پیدا ہو جاتی ہے۔ اِس نتیجے نے "پف انجن" کی شکل اختیار کی۔ یہ ریل کا پہلا انجن تھا جس کی



ڈاٹ کو بھاپ سے حرکت دی جاتی تھی اور اُس وجہ سے پہیّے گھومنے لگتے تھے۔ پھر بھاپ سے چلنے والے جہاز (steam-ships) تیار کیے گئے اور مختلف چیزیں بنانے کے لیے کارخانوں میں

مُختلف قِسم کی مشینیں تیّار کی گئیں - بھاپ اِنجن دِن دُوُنی اور رات چوگنی ترقّی کرتا گیا اور آج یہ کیفیت ہے کہ بعض اِنجن ڈیڑھ لاکھ سے لے کر دو لاکھ اسپی قُوّت (horse-power) تک پیدا کر سکتے ہیں ۔

اسپی قُوّت عجیب نام ہے! یہ کیا بلا ہے؟ یہ بڑے مزے کی بات ہے - اسپی قُوّت (horse-power) ایک معمُولی گھوڑے کی طاقت کا دُوسرا نام ہے ۔



کہتے ہیں کہ اسپی قُوّت تقریباً بیس آدمیوں کی طاقت کے برابر ہوتی ہے ؛ یعنی جب یہ کہا جائے کہ فلاں بھاپ اِنجن پچاس ہزار اسپی قُوّت کا ہے تو اُس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ :



پچاس ہزار گھوڑوں یا دس لاکھ آدمیوں کی طاقت سے کسی چیز کو کھینچ سکتا ہے یا دبا سکتا ہے۔ ذرا غور تو کرو کہ یہ اِنسان کا کس قدر زبردست کارنامہ ہے! اِنسان نے ایک بھاپ اِنجن کی شکل میں دس لاکھ نئے غلام پیدا کر لیے ہیں! بھلا سوچو تو، دس لاکھ غلاموں کو کتنا کھلانا پلانا پڑے گا! مگر اب اِنسان کو اِن کے کھلانے پلانے کے اِنتظام کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ البتّہ کچھ کوئلے اور کچھ پانی کا بندوبست کرنا پڑے گا۔

اِس حیرت انگیز دریافت اور اِس کرشمے کے انکشاف کے بعد بھی اِنسان چین سے نہیں بیٹھا۔ بات یہ ہے کہ "اِنسان ہر وقت شکایت کرتا رہتا ہے اور اُس میں قناعت کا مادّہ نہیں ہے۔" چنانچہ دریافت جاری رہی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تقریباً ۱۸۸۰ء میں تیل کا اِنجن (oil engine) ایجاد ہو گیا۔ تیل اِنجن میں اُستوانے میں بھاپ بھرنے کے بجائے تیل اور ہوا کا آمیزہ (mixture) بھرتے ہیں۔ پھر اُسے جلاتے ہیں تو اُس میں ایک دھماکا ہوتا ہے! جو بڑے زور سے ڈاٹ کو پیچھے دھکیل دیتا ہے۔

تیل اِنجن بھاپ اِنجن سے سستا اور زیادہ طاقتور ثابت ہُوا اور اُس کی جگہ اب یہی اِستعمال ہونے لگا ہے۔ کارخانوں اور جہازوں کو چلانے میں پانی کھینچنے میں اور بجلی پیدا کرنے میں اب بھی بھاپ کا مُقابلہ تیل سے ہو رہا ہے مگر ہر موقع پر تیل بھاپ کو مات دیتا چلا جاتا ہے۔

جس طرح بھاپ کی مدد سے ریل اور جہاز چلائے گئے اُسی

طرح تیل انجن سے موٹر کار چلانے اور ہوائی جہاز اُڑانے کے اِمکانات پیدا ہو گئے ۔

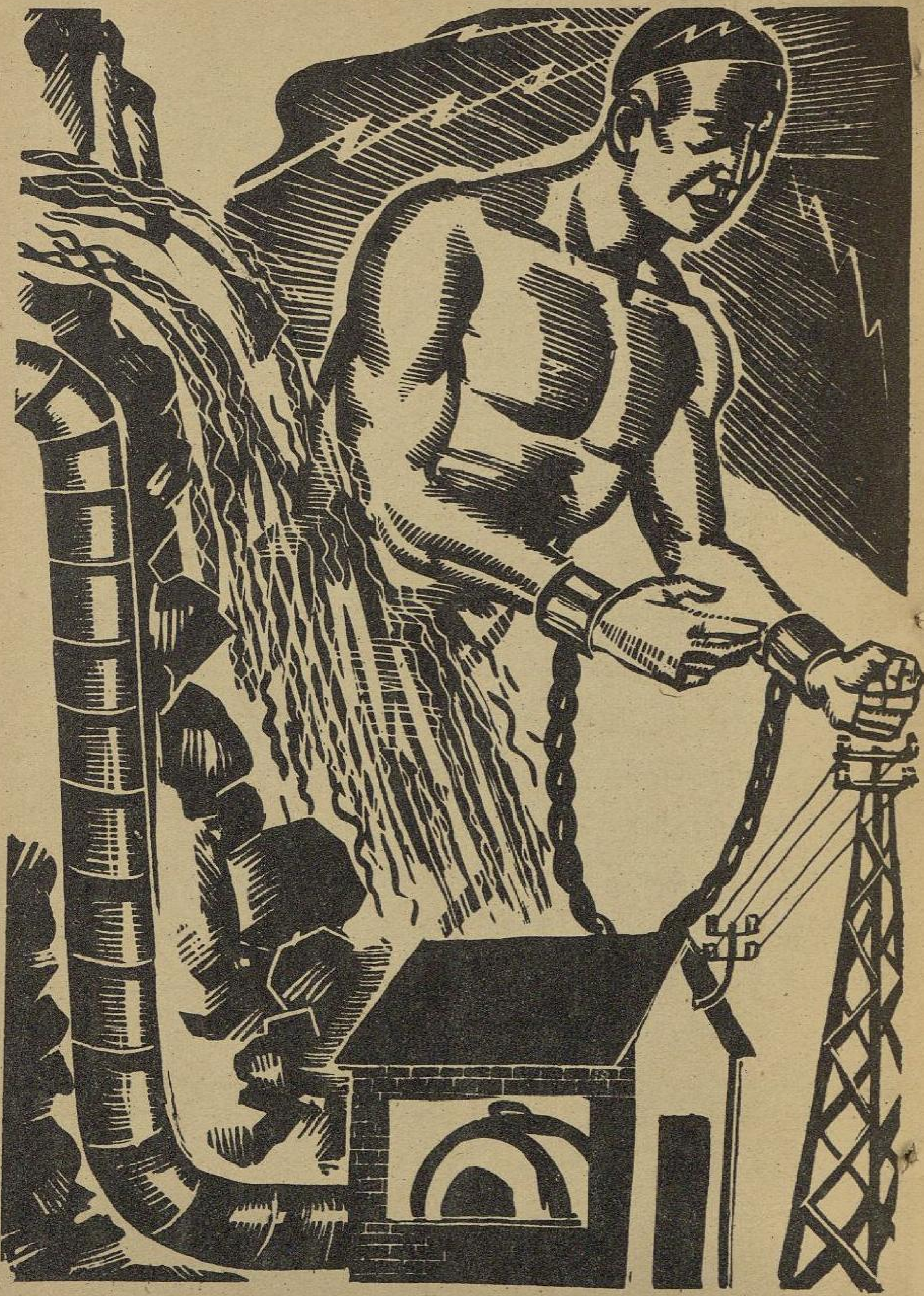
مگر اب اِنسان کِس چکّر میں ہے ؟ اِس کا بے چین دماغ کبھی نچلّا نہیں بیٹھتا ، وُہ پھر کسی دُوسری زیادہ حیرت انگیز قوّت پیدا کرنے کے ذریعے کی جُستجو میں ہے ۔ اگر سچ پُوچھو تو واقعی یہ اُس کی عقلمندی کی دلیل ہے ۔ اِس لیے کہ اِنسان کو آیندہ زیادہ سے زیادہ قُوّت کی ضرورت ہے ۔ مگر "کوئلہ اور تیل" جس سے کہ قُوّت پیدا کی جاتی ہے اُس کا ذخیرہ محدود ہے ۔

اِس لیے اِنسان اپنے پُرانے بچپن کے دوست ؛ یعنی پانی کی طرف متوجّہ ہُوا ۔ اب جب کہ اُس نے دھاتوں سے بڑے بڑے پہیّے اور لمبے لمبے تار تیّار کر لیے تو پھر اُسے یہ معلوم ہُوا کہ پانی سب سے بڑا جن ہے ۔ اب یہاں سے ہمارا دَور آ جاتا ہے اور "مدفُون قُوّت کا دَور ختم ہوتا ہے" ۔ یہ مدفُون اشیا (fossils) کیا ہیں ؟ یہی "کوئلہ اور تیل" جو بُہت قدیم زمانے سے زمین کی تہ میں دب کر محفُوظ ہو گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ آج کل کی چالاک نئی پود پُرانے لوگوں کو "پیاری[1] دقیانوسی ہڈّیاں" کہتی ہے ۔

اِس پانی کے جن کو کیسے قابُو میں لایا جاتا ہے ؟ پہاڑوں سے پانی آبشاروں کی شکل میں نیچے گرتا ہے اور پھر بہ کر دریا بن جاتا ہے ۔ اگر کسی ترکیب سے اِس کو نیچے گرنے کے بعد ہی روک لیا جائے تو اُس میں بہتے ہُوئے پانی کی زبردست قُوّت

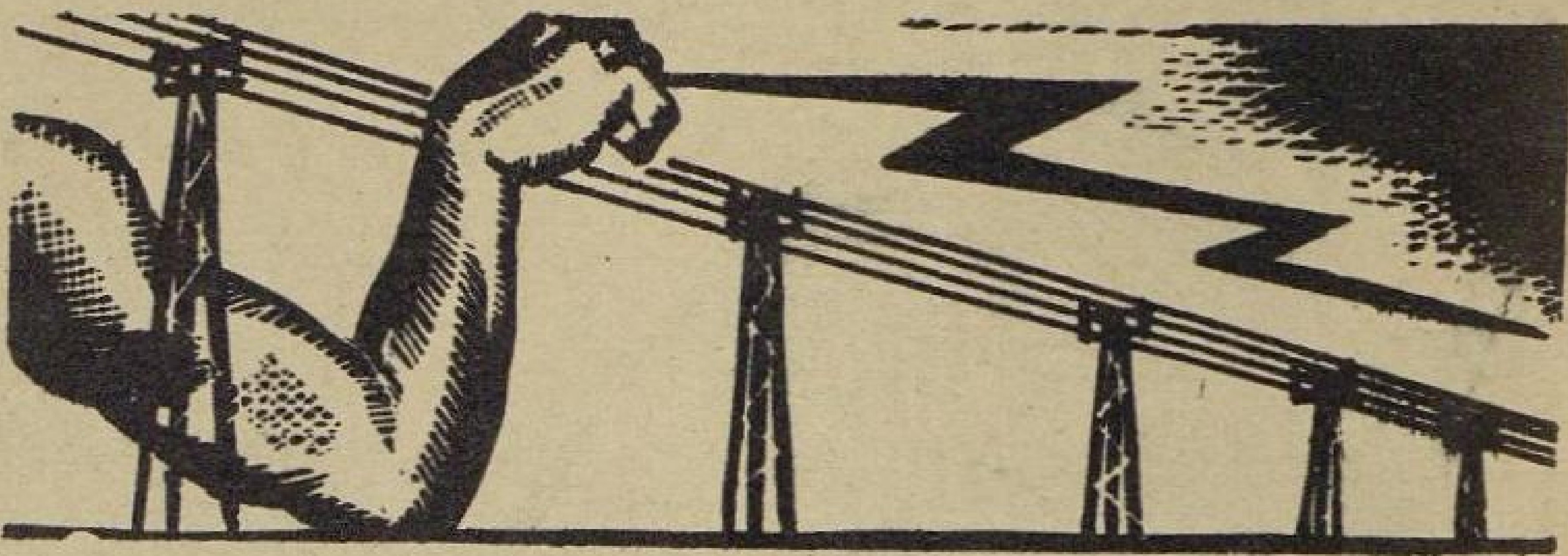
---

[1] انگریزی محاورہ ہے : "Dear old fossils!"



ہوتی ہے۔ بالکل اِسی قسم کی قُوت پہاڑیوں پر پانی کے خزانے بنا کر اور وہاں سے پانی بڑے بڑے نلوں کے ذریعے نیچے لا کر پیدا کی جا سکتی ہے۔ بُلندی کی وجہ سے پانی نہایت تیزی اور زور کے ساتھ نیچے اُترتا ہے اور یہاں اِس سے بڑے بڑے پن پہیّے (water-wheels) چلائے جا سکتے ہیں؛ جسے اصطلاح میں تربائن (turbines) کہتے ہیں۔ یہ تربائن ڈائینمو چلاتے ہیں جس سے برقی قُوت پیدا ہوتی ہے۔ اب اِس برقی قُوّت (electric power) یعنی برقی رَو (electric current) کو تاروں کے ذریعے مختلف مقامات میں پُہنچا کر دُوسرے چھوٹے چھوٹے ڈائینمو چلا سکتے ہیں جن سے وہی کام لیے جا سکتے ہیں جو کوئلے اور تیل کی قُوّت سے انجام پاتے ہیں؛ مُختصر یہ کہ اِس طرح آبی قُوّت (water-power) سے بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ مگر کوئلے اور تیل سے بھی تو بجلی پیدا ہوتی ہے؛ ٹھیک ہے، لیکن ایک دِن ایسا آئے گا کہ کوئلہ اور تیل جل کر ختم ہو جائے گا مگر جب تک زمین گردش کرتی رہے گی، آفتاب چمکتا رہے گا اور پانی برستا رہے گا، آبی قُوّت کا ذریعہ؛ یعنی پانی کبھی ختم نہیں ہوگا۔

آبی قُوّت نہ صرف دوامی ہے بلکہ بعض مقاموں پر کوئلے اور تیل سے سستی بھی ہے۔ اِس کا ایک بڑا فائدہ اور بھی ہے۔ یہ تاروں کے ذریعے دُور دُور تک دوڑائی جا سکتی ہے۔ آج کل اِسے دو سو یا تین سو میل تک لے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ امریکہ میں برقی رَو کو آبشار نائیگرا سے نیویارک تک لے گئے ہیں جس کا فاصلہ کوئی چار سو پچّاس میل ہے۔ چنانچہ اب صرف ایسی ہی گھومنے



والی چیزیں ؛ مثلاً جہاز، موٹر کار، طیارے (aeroplanes) رہ گئے جن کے لیے اب بھی کوئلے یا تیل کی ضرورت ہے ٭

دُوسرے مُلکوں کی طرح، گو دیر ہی سے سہی، ہندوستان کو بھی قُوّت پر قابو پانے کے لیے مُختلف مدارج طے کرنے پڑے ہیں۔ ہم اب برق کے دَور میں داخل ہو رہے ہیں۔ جب کبھی ہم ریل یا موٹر میں بیٹھ کر دیہات میں سے گُزرتے ہیں تو کہیں کہیں ہمیں چار ستونوں کے فولادی کھمبے دِکھائی دیتے ہیں جن کے کئی کئی بازُو ہوتے ہیں۔ اِن کے ہر بازُو پر تانبے کے تار ہوتے ہیں جن میں سے برقی رَو گُزرتی ہے ٭

اِس برقی رَو کی تقریباً ایک تہائی مقدار آبی قُوّت سے حاصل ہوتی ہے۔ بمبئی، مدراس اور پنجاب کے صُوبوں میں بڑے بڑے آبی قُوّت کے اِسٹیشن موجود ہیں۔ یہ آبی برقی اِسٹیشن (hydro-electric station) کہلاتے ہیں۔ اِن میں سب سے بڑا اِسٹیشن خود بمبئی کا ہے۔ جہاں ٹاٹا کے مشہور و معروف کارخانے کی طرف سے مغربی گھاٹ پر پانی کے خزانے (reservoirs) بنائے گئے

ہیں - یہ زمین سے کوئی سولہ ہزار فٹ اونچے ہیں - وہاں سے بڑے بڑے نلوں کے ذریعے پانی نیچے لاتے ہیں جس سے دو لاکھ تیس ہزار اسپی قوّت کی برق پیدا ہوتی ہے - اسی قوّت سے بمبئی میں روشنی ہوتی ہے ، اسی سے وہاں کے ۶۹ کارخانوں میں سے ۵۲ کارخانے چلائے جاتے ہیں ، اسی قوّت سے وہاں کی ٹریم گاڑی چلائی جاتی ہے اور اسی قوّت سے بمبئی سے ایک جانب پُونا اور دُوسری جانب اگت پوُری تک ریل چلائی جاتی ہے ؀

دُوسرا سب سے بڑا آبی قوّت کا مرکز دکن میں واقع ہے - یہاں کاویری دریا کے آبشاروں سے فائدہ اُٹھاکر برقی قوّت پیدا کی گئی ہے - اِس رَو سے دُوسرے کام لینے کے علاوہ کولار کی سونے کی کانوں میں کام لیا جاتا ہے جو ریاست میسور میں واقع ہیں ؀

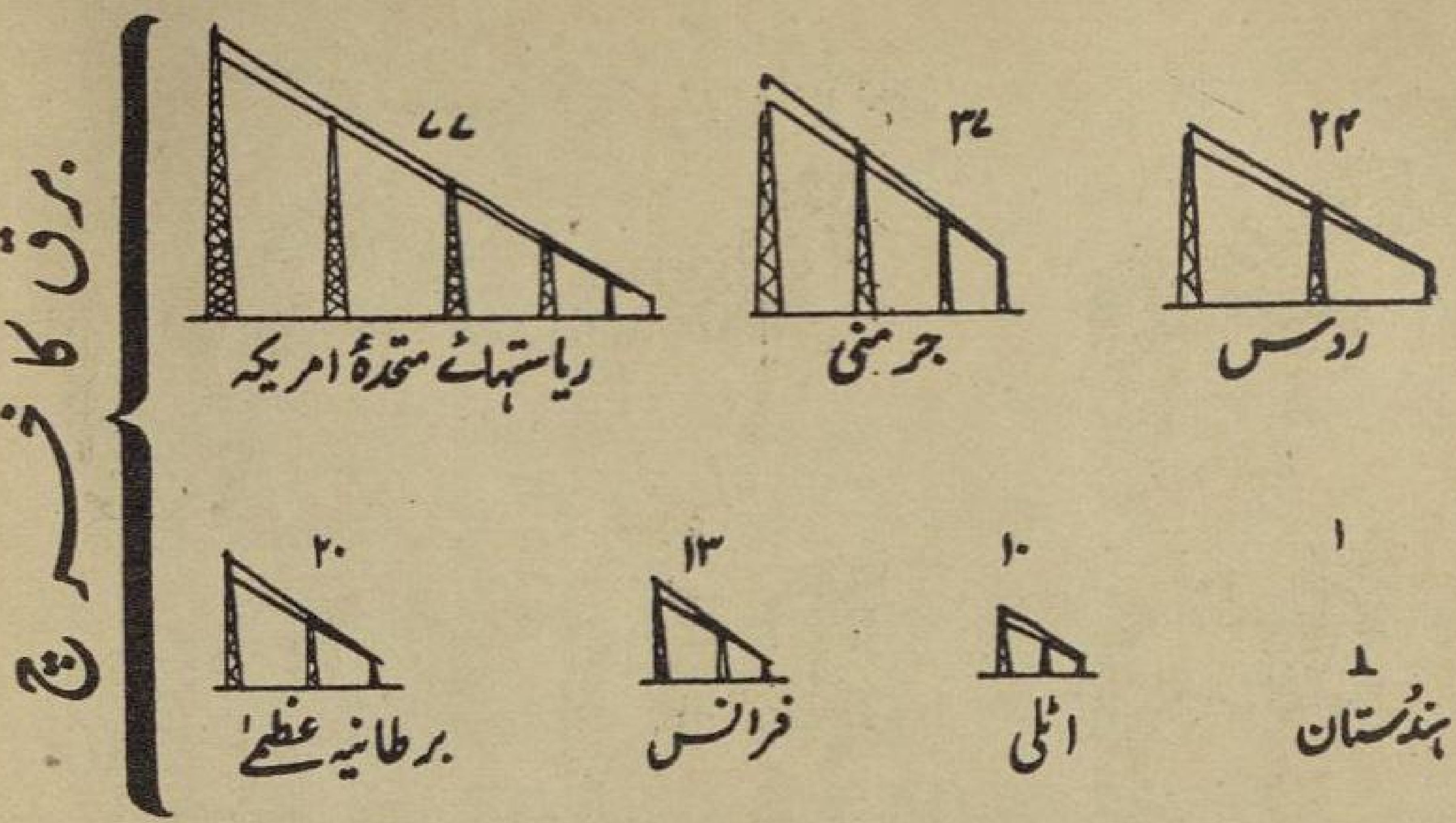
تیسرا بڑا اِسٹیشن پنجاب کی ریاست منڈی بمقام شانن جوگندر نگر میں واقع ہے جہاں سے بجلی پنجاب کے مختلف حِصّوں میں جاتی ہے ؀

یہ آبی برقی اِسٹیشن ایک "جال دار نظام" (grid system) کے بموجب کام کرتے ہیں - اِس کا مطلب یہ ہے کہ قُرب و جوار کے اِسٹیشنوں کو تاروں کے ایک جال سے ملاکر برقی قوّت اِکٹھی کی جاتی ہے اور اِس طرح ایک دُوسرے کی کمی کو پُورا کرتی ہے - ہندُستان میں اِس قسم کے پانچ "جال دار نظام" ہیں : یعنی بمبئی ، مدراس ، میسُور ، صوُبجات متّحدہ ، پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوُبے

ہیں۔ اِن میں تقریباً چھے لاکھ اسپی قُوّت کی برق فراہم کرنے کی قابلیت ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں جو آبی قُوّت حاصل کی جا رہی تھی اب اُس سے کوئی پندرہ گنا زیادہ قُوّت حاصل کی جا رہی ہے۔

ہندُستان کے مشرق میں آبی قُوّت زیادہ نہیں ہے۔ اِس لیے وہاں عام طور پر کوئلہ استعمال کیا جاتا ہے؛ چنانچہ کلکتہ میں بجلی کی روشنی کے لیے مقامی طور پر کوئلہ ہی استعمال کیا جاتا ہے اور یہی کیفیت بہار میں جمشید پور کی ہے جہاں لوہے اور فولاد کے کارخانے قائم ہیں۔ آج کل دو بڑے اِسٹیشن بنائے جا رہے ہیں جہاں کوئلہ استعمال ہوگا؛ گیا (بہار میں) اور جمونیاٹنڈ۔ اِن میں سے ہر ایک بیس بیس ہزار اسپی قُوّت کی برق پیدا کرے گا اور اِن دونوں میں جال دار نظام ہوگا۔

بھلا یہ تو بتاؤ کہ ہم کُل کتنی برق استعمال کر رہے ہوں گے؟ قریب قریب پندرہ لاکھ اسپی قُوّت کا اندازہ کیا گیا ہے۔ بظاہر تو یہ مقدار بہُت بڑی معلوم ہوتی ہے مگر درحقیقت یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ بڑے مُلک تو رہے ایک طرف بعض بہُت چھوٹے چھوٹے مُلکوں میں جو برق استعمال ہو رہی ہے اُن کے مقابلے میں ہمارے ہاں کا خرچ کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اِس بات کا اندازہ تمھیں شکل صفحہ ۱۶۴ کے دیکھنے سے ہوگا۔



اگر تمھیں یہ بتایا جائے کہ غیر مُلکوں میں کس قدر برق صرف ہوتی ہے تو تمھیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ ہم اُنکے مقابلے میں کتنے پیچھے ہیں۔ دیکھو! ناروے میں آبی قوّت سے فی ہزار آبادی کے لیے ۷۰۰ اسپی قوّت کی برق پیدا کی جاتی ہے، کینیڈا میں ۶۰۰، سوئیزر لینڈ میں ۵۰۰، سویڈن میں ۲۰۰، ریاست ہائے متحدۂ امریکہ میں ۱۰۰۔ اور ہندستان میں؟ فی ہزار آبادی کے لیے ایک اسپی قوّت سے کچھ زیادہ!

یہ قابلِ شرم ہے۔ کیوں! ہے کہ نہیں؟ مگر تعجب خیز نہیں ہے۔ جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں چند ہی کارخانے ہیں اور گنتی کی چند ریلیں ہیں جو بھاپ اِنجنوں سے چلائی جاتی ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں تو برقی روشنی ہے مگر شہر سے باہر برق کا نام بھی نہیں۔ پھر جو لوگ شہر میں رہتے سہتے ہیں اُن میں

اسپی قوّت فی ہزار آبادی



بہُت کم ایسے ہیں جو ریڈیو استعمال کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم جو اِس قدر کم برق استعمال کر رہے ہیں اُس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اِس سے کام لینا نہیں جانتے۔ اچھا، اگر ہم چاہیں تو کیا زیادہ برقی قُوّت ہمیں مِل سکتی ہے؟ کیوں نہیں، زیادہ ہی نہیں بلکہ ہزار گُنا زیادہ!

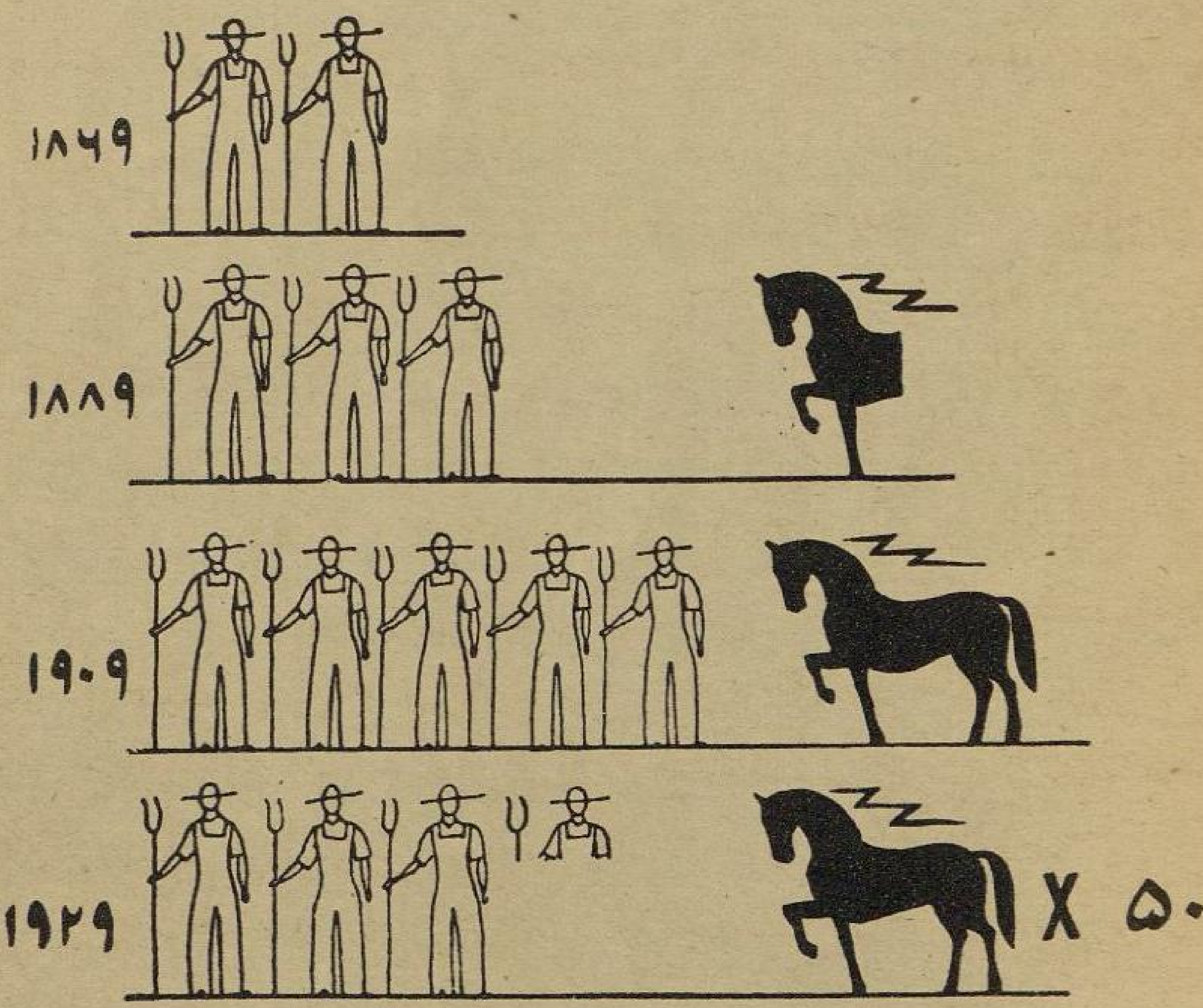
کینیڈا اور ریاست ہائے متّحدہ امریکہ کے بعد، دُنیا میں سب سے زیادہ ہندُستان کو آبی قُوّت کے بہترین ذریعے حاصل ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں کینیڈا میں چار کروڑ تیس لاکھ اور امریکہ میں تین کروڑ پچاس لاکھ اسپی قُوّت پیدا کی جا سکتی ہے تو وہاں ہندُستان میں دو کروڑ ستّر لاکھ اسپی قُوّت کے ذریعے موجود ہیں۔ اب بھلا بتاؤ کہ تمھارے خیال میں ہم آج کل اِس میں سے کِتنی قُوّت استعمال کر رہے ہوں گے؟ پچاسویں حصّے سے بھی کم! مگر

جہاں ہم اِتنی بڑی مقدار میں سے صرف پچاسواں حصّہ اِستعمال کر رہے ہیں وہاں ریاست ہائے متحدہ امریکہ ایک تہائی اِستعمال کر رہا ہے اور یہی حالت قریب قریب فرانس اور جاپان کی بھی ہے۔ جرمنی آدھے سے زیادہ اور سوئٹزر لینڈ تو تقریباً پون حصّہ استعمال کر رہا ہے۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِن چھوٹے مُلکوں کے باشندوں کو اللہ میاں نے ہمارے مقابلے میں ۳/۴ زیادہ دِماغ عطا فرمایا ہے!

کئی سال گزرے کہ ایک انگریز انجینیر نے "خُوش حال ہندُستان" (Happy India) کے نام سے ایک کتاب لِکھی تھی جس میں ہمارے مُلک کے ذرائع کی نہایت دِل خوش کرنے والی تصویر کھینچی تھی۔ اُس نے ہماری آبی قُوّت کا خُوب حساب لگایا ہے۔ وُہ کہتا ہے کہ کوہِ ہمالہ اور دُوسرے پہاڑوں کے سِلسلوں کی لمبائی تین ہزار مِیل ہے۔ ایک مکعب فُٹ (cubic foot) پانی ایک ہزار فٹ سے گِرکر دو اسپی قوّت پیدا کر سکتا ہے۔ اِس حساب سے آبشاروں اور دریاؤں سے پندرہ کروڑ اسپی قُوّت پیدا کی جاسکتی ہے۔ اِس تخمینے میں مُصنّف نے ذرا فراخ دِلی سے کام لیا ہے کیونکہ بہتا ہُوا سب پانی آسانی سے اور کفایت کے ساتھ ایک جگہ جمع کرکے برقی قوّت میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا؛ تاہم اِس سے ہمارے پہاڑی سِلسلوں سے برق حاصل کرنے کے بڑے امکانات ظاہر ہوتے ہیں۔

جب قُدرت ہمارا اِس قدر ساتھ دے تو پھر ہم کیا کچھ نہیں

کر سکتے؛ ہم اپنی ضرورتوں کے مطابق سامان تیار کرنے کے بڑے
بڑے کارخانے قائم کر سکتے ہیں۔ ہم گانوؤں میں برق دوڑا سکتے
ہیں جس سے نہ صرف کسانوں کے جھونپڑے روشن ہو جائیں گے
بلکہ فصلیں کاٹی چھانٹی جا سکتی ہیں اور پانی کے پمپ اور اناج پیسنے
کی مشینیں بھی چلائی جا سکتی ہیں۔ اِس تصویر سے تمھیں اندازہ ہوگا
کہ ریاست ہائے متحدۂ امریکہ میں زراعت کے کاموں کے لیے کتنی
برق استعمال ہوتی ہے۔ اِس تصویر میں ایک آدمی دس لاکھ کسانوں
کو ظاہر کرتا ہے اور ایک گھوڑا پچاس لاکھ برقی توانائی کی



اسپی قوت بنانا ہے۔

ہم اپنے بھائیوں کی زندگی کو خوش و خرّم بنانے کے لیے ریڈیو، گراموفون، ٹیلیفون اور سنیما کا رواج دے سکتے ہیں۔ ریڈیو سے مدارس کے لیے نشریات (broadcast) کا انتظام کرسکتے ہیں جو بچّوں کے لیے انگریزی میں نہیں بلکہ ہندُستانی اور ہندُستان کی دوسری زبانوں میں ہوں گے۔ اِن تمام کاموں کے بعد اگر کچھ برق بچی رہی تو ہم اُس کو ہوا سے نائٹروجن (nitrogen) حاصل کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ جس سے "نائٹرولین" (nitrolin) بنایا جا سکتا ہے، جو زمین کو قوت دینے کے لیے ایک نہایت عمدہ کیمیائی کھاد ہے۔

اِن تمام کاموں کو انجام دینے کے لیے ہمیں بہت سی برقی مشینوں کی ضرورت ہوگی۔ اب تو ہم ضروری مشینیں یورپ اور امریکہ سے منگواتے ہیں؛ چنانچہ گزشتہ سال ہم نے ایسی مشینوں کے لیے تین کروڑ ستّر لاکھ روپیہ ادا کیا۔ مگر یہ مشینیں کم قیمت میں ملنی چاہئیں جس کا ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اُن کو اپنے ہی ملک میں تیار کرنے لگیں۔

جب ہم یہ سب کچھ کر لیں گے، اپنی پوری آبی قوت سے فائدہ اُٹھا لیں گے اور اپنے کوئلے کے پورے ذخیرے کو استعمال کر چکیں گے۔ تو اُس وقت ہم دُنیا کی سب سے زیادہ دولت مند قوم بن جائیں گے۔ اُس وقت سمندروں کی موجوں کی توانائی استعمال کرنے کے اِمکانات بھی ظاہر ہو جائیں گے۔ پھر

ہم سورج کی توانائی کو اپنے قبضے میں لانے کی کوشش کریں گے جو ہمیں روشنی پہنچاتا ہے۔ ایک ایسی چھوٹی سی موٹر ایجاد ہو چکی ہے جو دھوپ کی قوت سے چلتی ہے! کیا تمھیں کبھی یہ بھی خیال آیا کہ زمین کے اندر حرارت کا کس قدر زبردست خزانہ چھپا ہوا ہے جس سے ہم گہرے گڑھے کھود کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ اٹلی میں لاڈاریلا (Ladarella) میں بھاپ زمین سے نکلتی ہے جس سے چار ہزار اسپی قوت پیدا کی جاتی ہے! اچھا تو بتاؤ ہم بھی کیا کچھ نہیں کر سکتے؟

مشینیں

آدمی سے ہیں کہیں بڑھ کر مشینیں سخت جان
جسم ہے فولاد کا اور برق ہے روحِ رواں

کام جو گھنٹوں میں بھی ہوتا نہ تھا انسان سے
ختم وہ منٹوں میں اب ہونے لگا ہے بے گماں

ان کی قوت اور طاقت کو بیاں کیا کیجیے
ان کی سرعت اور نفاست ہے زمانے پر عیاں

یہ مشینیں برق ہیں سب اپنے اپنے کام میں
کل دبا کر جس کا جی چاہے وہ کر لے امتحان

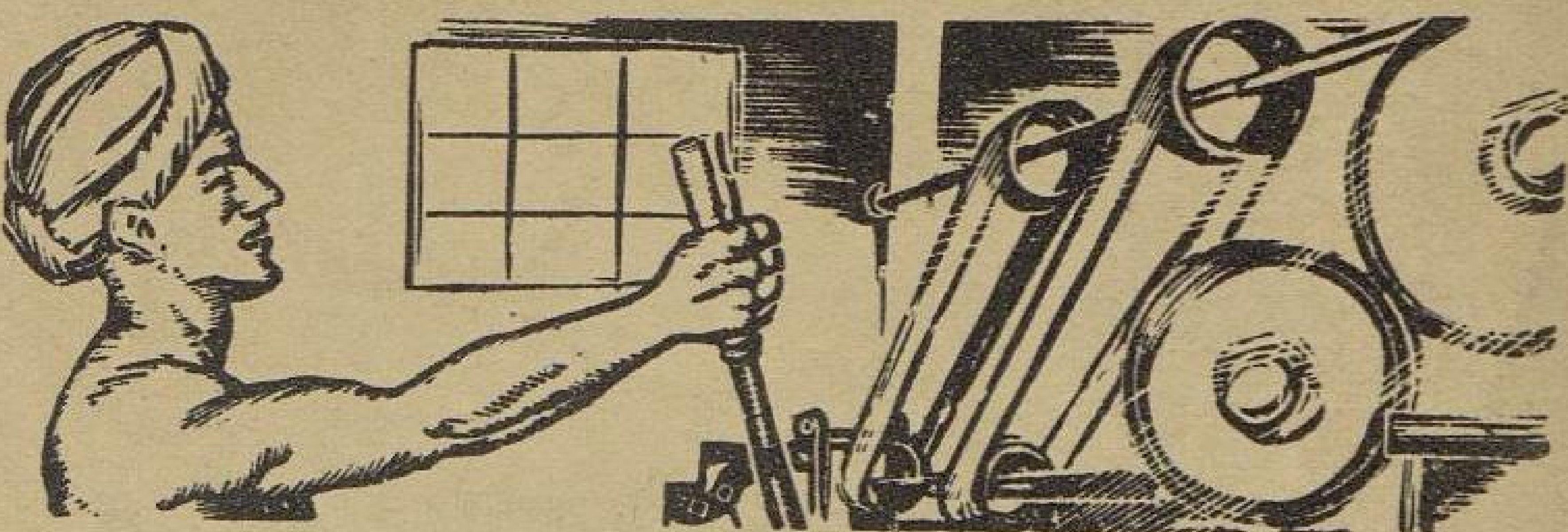
بعض ایسی ہیں کہ ڈالو اک طرف لوہے کی سیخ
اور نکالو دوسری جانب سے لاکھوں ڈھیریاں

ڈھالتی ہے پیچ کوئی اور کوئی چاقو چھرے
کوئی الپنیں بناتی ہے تو کوئی سوئیاں

سنتے ہیں اِن سب مشینوں پر روپے چودہ کروڑ
صرف ہر اِک سال میں کر دیتا ہے ہندوستان

(عصمت)





گیارھواں باب

فولادی آدمی

کیا تُم جانتے ہو کہ سوویٹ رُوس کے آمر (ڈِکٹیٹر) کو اِسٹالن (Stalin) کیوں کہتے ہیں؟ یہ اُس کا نام نہیں ہے۔ اُس کا اصلی نام جوزف جوگاش ویلی (Josef Djugashvili) ہے۔ اِسٹالن اُس کا لقب ہے۔ اِس لقب کی وجہ یہ ہے کہ رُوسی زبان میں اسٹالن کے معنی ہیں "فولادی آدمی" (Man of Steel) کیونکہ وُہ بہُت سخت آدمی ہے، اِس لیے لوگ اُسے اِسٹالن کہنے لگے۔

اِسٹالن کے عِلاوہ رُوس میں اور بھی کئی فولادی آدمی ہیں۔ دُوسرے مُلکوں میں بھی ایسے آدمی ہزاروں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ یہ آمروں کی طرح کبھی وبالِ جان نہیں ہوتے! یہ اُنسے زیادہ فائدے مند ہوتے ہیں۔ یہ فولادی آدمی کون ہیں؟ ہم اِن

کو اپنی زبان میں کلیں یا مشینیں کہتے ہیں۔ یہ مشینیں فولاد کی بنی ہوئی ہوتی ہیں اور یہ وُہ سب کام کرتی ہیں جو آدمی کرتا ہے صرف فرق یہ ہے کہ مشین آدمی سے زیادہ پھُرتی اور زیادہ صفائی سے کام کرتی ہے ؀

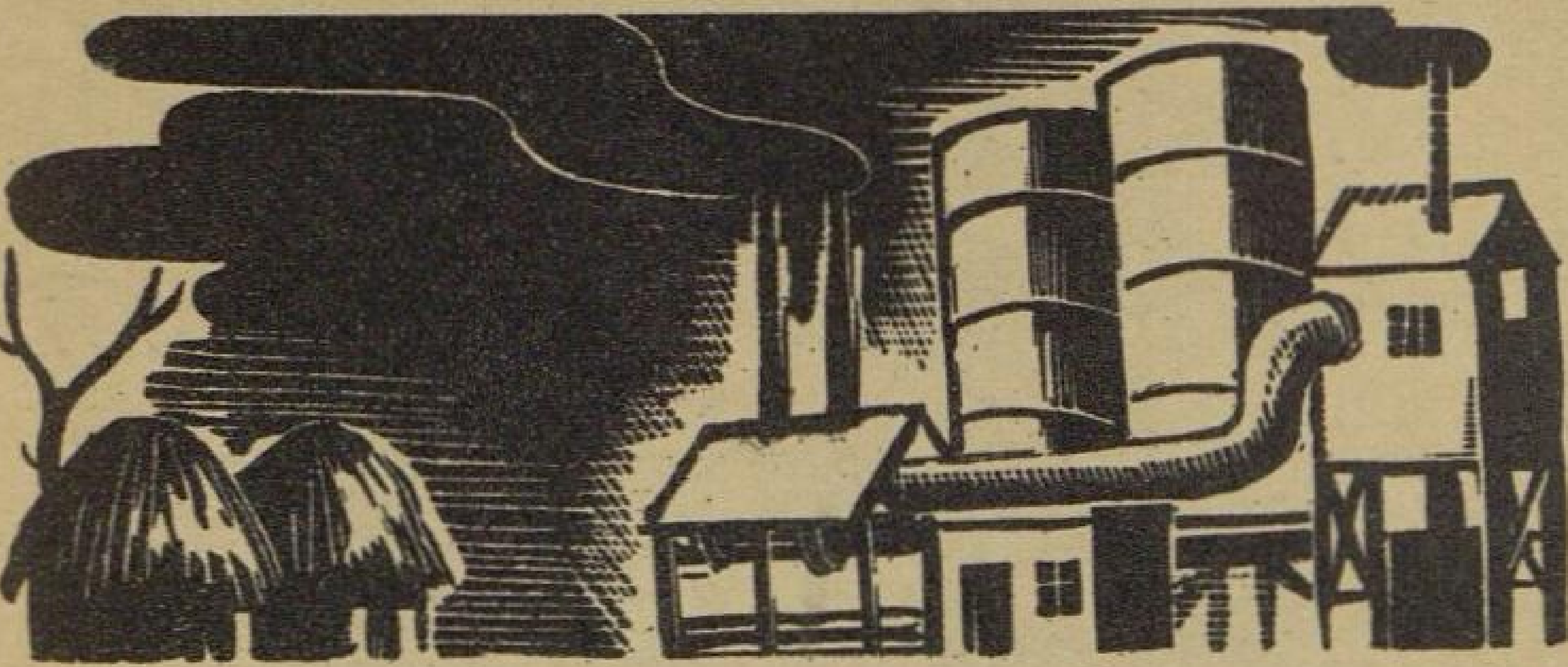
جس مُلک کی زمین میں کچی دھاتوں کے خزانے ہوں، جو لوہے اور دُوسری دھاتوں سے مالا مال ہو اور جس میں پانی اور کوئلے جیسی نعمتیں موجُود ہوں تو وہ مُلک آسانی سے سیکڑوں مشینیں بنا سکتا ہے۔ اِس لیے کہ مشینیں دھات سے بنتی ہیں اور برقی قُوّت سے چلائی جاتی ہیں۔ لیکن ہندُستان بدقسمتی سے، ایسے مُلکوں میں شامل نہیں ہے۔ ہم ابھی بتا چُکے ہیں کہ ہمارے ہاں دھات کثرت سے ہے؛ ہمارے ہاں زمین کی تہ میں اِس قِسم کا لوہا ہے جو دُنیا میں اپنی نظیر آپ ہے۔ کوئلہ بھی کثرت سے ہے اور آبی قُوّت (water-power) تو بے حساب ہے ؀

بہر حال جیسا کہ ہم پچھلے صفحوں میں بتا چُکے ہیں کہ ہماری کپڑے کی گرنیوں اور بجلی گھروں کی مشینری دُوسرے مُلکوں سے خریدی جاتی ہے اور یہی حال باقی تمام مشینوں کا ہے جو ہندُستان میں استعمال کی جاتی ہیں۔ مشینری خریدنے کے لیے ہمیں کوئی تیرہ یا چودہ کروڑ روپے سالانہ خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ یہی نہیں، بلکہ چھوٹی سے چھوٹی چیز؛ مثلاً الپنیں (pins) پینچ اور سوئیاں بھی ہمیں دساور ہی سے منگوانی پڑتی ہیں! موٹر کار، دُخانی جہاز، اور ہوائی جہاز کا تو کیا ذِکر۔ واقعہ یہ ہے کہ دو سال پہلے تک اُن کے

بنانے کا ہمیں بھول کر بھی خیال نہ آیا تھا۔ اور اب بھی بس خالی باتیں ہی باتیں ہیں! کہا جاتا ہے کہ عنقریب بمبئی میں موٹرکار کا کارخانہ قائم ہو جائے گا، بنگلور میں ہوائی جہاز بنائے جائیں گے اور وزیگا پٹم میں جہاز تیار ہونے لگیں گے۔

تم سوال کروگے کہ ہماری تمام لوہے کی کچ دھات کس کام آتی ہے؛ آج سے تقریباً چالیس سال پہلے یہ سب کی سب جہازوں میں لاد کر اُسی طرح دوسرے مُلکوں میں بھیج دی جاتی تھی جس طرح کہ اب مینگنیز کچ دھات روانہ کی جا رہی ہے۔ لیکن بعد میں ہمیں کچھ عقل آگئی اور اب ہم اُتنے بے وقوف نہیں رہے۔ یہ عقل کیسے آئی، اس کا بھی تھوڑا بہت حال سُن لو۔ اِس صدی کے ابتدائی دَور میں ایک نہایت عقلمند ہندوستانی، جمشید جی ٹاٹا کو یہ خیال ہُوا کہ ہم اپنی ضروریات کی کوئی چیز اُس وقت تک نہیں بنا سکتے جب تک ہم ایسی مشینیں نہ بنائیں جن سے وُہ چیزیں تیار کی جاتی ہیں اور ایسی مشینیں اُس وقت تک نہیں بن سکتیں جب تک ہم خود لوہا اور فولاد یہاں تیّار نہ کرنے لگیں۔

چُنانچہ اِس صنعت کی ابتدا کرنے کے لیے ٹاٹا نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور ایک ایسا گانو ڈھونڈ نکالا جو بہار کے گنجان جنگلوں میں واقع تھا۔ اِس گانو کا نام سکچی تھا۔ اب یہ نام نہیں رہا ہے؛ جمشید پور ہو گیا ہے۔ اب یہ گانو، گانو نہیں رہا۔ یہ آناً فاناً میں ایک بہت بڑا شہر بن گیا جس میں اِس وقت ایک لاکھ چالیس ہزار آدمی آباد ہیں۔ یہ کایا پلٹ، کیسے ہوئی؟



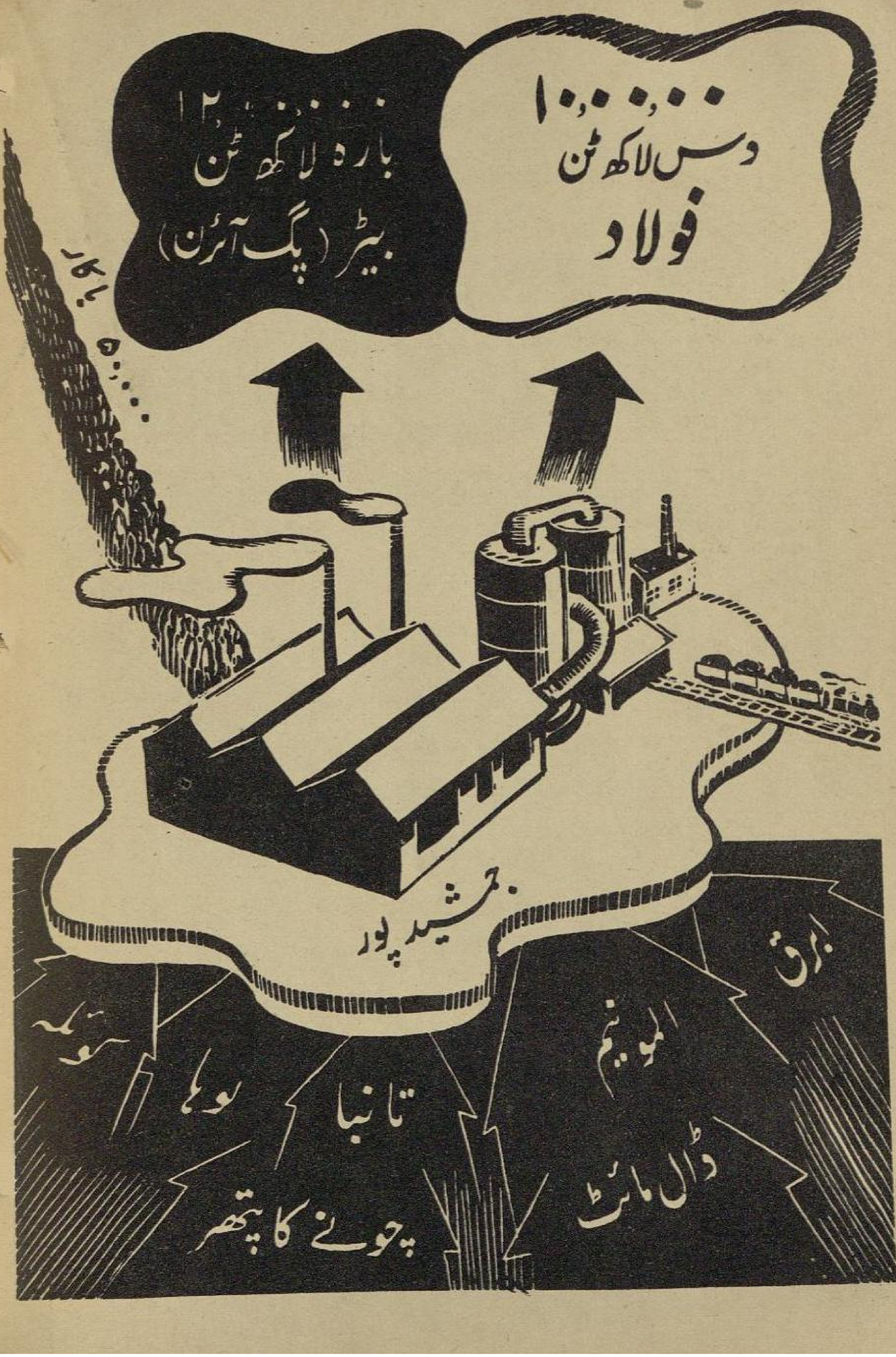
ایک مرتبہ میری ایک خاتون دوست نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ جب جنگلی قومیں غذا اور زمین کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی تھیں تو وہ اپنے پڑاؤ کی جگہ کا اِنتخاب اپنے گرو پر چھوڑ دیتی تھیں۔ وہ جہاں حکم دے دیتا سب وہیں ڈیرے ڈال دیتے تھے۔ گرو کا دعویٰ تھا کہ جگہ کے اِنتخاب میں دیوتا اُس کی مدد کرتے ہیں۔

بس جمشید جی ٹاٹا بھی کچھ اِسی قِسم کا سیانا آدمی تھا۔ اُس نے بھی ایک ایسا لاجواب مقام انتخاب کیا جہاں وہ تمام چیزیں موجود تھیں جو ایک لوہے کے کارخانے کے لیے نہایت ضروری اور اہم خیال کی جاتی ہیں ؛ یعنی کوئلہ ، لوہا ، تانبا ، ایلومینیم ، ابرق ، چونے کے پتھر اور ڈالومائٹ وغیرہ۔ اِس مقام میں ایک اَور بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ اُس ریلوے لائن پر واقع تھا جو کلکتہ سے ناگپور اور بمبئی جاتی ہے۔ یہ دریائی رستوں سے بھی قریب تھا جو کلکتہ کی طرف جاتے ہیں۔

اِس طرح گرد و غُبار کے بادلوں اور لوہے کی گرج میں سکچی

گانو دم کے دم میں ایک فولادی شہر: یعنی ہندُستان کا "پٹس برگ" (Pittsburgh) بن گیا۔ جانتے ہو پٹس برگ کو؟ یہ امریکہ میں فولاد سازی کا سب سے بڑا مرکز ہے ۔

آج ٹاٹا کا کارخانہ بھی، سلطنت برطانیہ میں لوہے کا سب سے بڑا کارخانہ ہے اور دُنیا کے بارہ بڑے کارخانوں میں شامل ہے۔ اِس کارخانے میں پچاس ہزار مزدُور کام کرتے ہیں اور بارہ لاکھ ٹن پِگ آئرن یعنی بِیٹر اور دس لاکھ ٹن اسٹیل یعنی فولاد سالانہ تیار ہوتا ہے۔ یہ پِگ آئرن (pig iron)؛ یعنی بیٹر اور اسٹیل یعنی "فولاد" کیا چیز ہے؟ پہلے اسے سمجھ لو۔ بات یہ ہے کہ کوئی دھات ہو، بیٹر ہو یا فولاد، وُہ زمین میں ٹھوس ڈلوں کی شکل میں نہیں پائی جاتی۔ وُہ مٹّی کے ڈھیلوں میں مِلی ہوئی ہوتی ہے؛ جسے کچ دھات کہتے ہیں۔ دھات حاصل کرنے کے لیے پہلے اُن ڈھیلوں کو پگھلاتے ہیں۔ یعنی لوہے کی کچ دھات کو پہلے بھٹّی میں ڈالتے ہیں جو اِس قدر گرم ہو جاتی ہے کہ لوہا پگھل کر پانی کی طرح بہنے لگتا ہے۔ اب اِس پگھلے ہوئے لوہے کو سانچوں میں بھر کر ٹھنڈا کرتے ہیں۔ چونکہ اِن سانچوں کی شکل سُؤر سے مِلتی جُلتی ہوتی ہے اِس لیے اِس کچّے پکّے اور کھُردرے لوہے کو انگریزی پِگ آئرن (pig iron) کہتے ہیں۔ اب اِسی لوہے میں کاربن اور مینگنیز کی قِسم کی کچھ اور دھاتیں ملا کر فولاد تیار کرتے ہیں۔ فولاد لوہے سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے اور دوُسری خوُبی اِس میں یہ ہوتی ہے کہ اِس کو ہتھوڑوں سے کوُٹ پیٹ کر جو جی


۱۲,۰۰,۰۰۰
بارہ لاکھ ٹن
بیڑ (پگ آئرن)
۱۰,۰۰,۰۰۰
دس لاکھ ٹن
فولاد
جمشید پور
برق
المونیم
تانبا
لوہا
ڈال مائٹ
چونے کا پتھر

چاہے آسانی سے بنا سکتے ہیں۔

ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ لوہے سے صرف چھوٹی موٹی چیزیں بنایا کرتے تھے۔ ۱۷۷۹ء میں انگلستان میں دریائے سیورن پر لوہے کا پُل تیار کیا گیا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا سب سے پہلا پُل تھا۔ اِس سے لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور اُس وقت سے برابر لوہے کی صنعت میں دِن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی۔ اب لوہے کی جگہ زیادہ تر فولاد استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ فولاد لوہے کے مُقابلے میں زیادہ مضبوط اور زیادہ پائیدار ہوتا ہے۔ فولاد کی بیسیوں قسمیں ہیں۔ پُل بنانے کے لیے ایک قسم کا فولاد استعمال کرتے ہیں اور پہیّے بنانے کے لیے ایک دوسری قسم کا۔ بعض فولاد سخت ہوتے ہیں اور بعض "بے داغ" ہوتے ہیں، جن پر زنگ نہیں چڑھتا۔ یہ تمام قسم کے فولاد مینگنیز، کاربن یا اِسی قسم کی دوسری چیزوں کو خاص خاص مقدار میں شریک کرکے تیار کیے جاتے ہیں۔

تمام عجیب و غریب مشینیں فولاد ہی سے تیار کی جاتی ہیں جو بٹن دباتے ہی ہر قسم کے کام کرنے لگتی ہیں۔ چنانچہ ایک مشین تو ایسی ہے کہ اِس میں ایک طرف فولادی سلاخیں ڈالتے ہیں اور دوسری طرف سے بولٹ، ڈھبریاں اور پیچ ہزاروں کی تعداد میں تیار ہوکر نکلتے آتے ہیں۔ ایک اور مشین ایسی ہے کہ اُس میں ایک طرف تو لکڑی کے ٹکڑے ڈالتے ہیں اور دوسری طرف سے بنی بنائی ڈبیاں نکلتی ہیں جن میں بڑی صفائی سے دیا سلائیاں

بھری رہتی ہیں۔ ایک مشین اور بھی ہے جس میں ایک طرف تو تمباکو اور کاغذ ڈال دیا جاتا ہے تو دوسری طرف بنے ہوئے سگرٹ نکل آتے ہیں۔ اس کے علاوہ فولاد سے اور بہت سی چیزیں تیار کی جاتی ہیں مثلاً بائی سکلیں، ٹائپ رائیٹر اور سینے پرونے کی مشینیں وغیرہ جن سے تم اچھی طرح واقف ہو۔

فولاد کا ذکر کرتے کرتے ہم جمشید پور سے بھٹک گئے۔ تم شاید یہ سوال کروگے کہ ہندستان میں جس قدر لوہے یا فولاد کی ضرورت ہے کیا وہ ٹاٹا کا کارخانہ مہیا کر سکتا ہے؟

اس کا جواب وہی ہے جو ہم پہلے دے چکے ہیں: یعنی "نہیں" اس کا معاملہ بھی کپاس اور کپڑے کی طرح ہے۔ ہم ادھورا کام کرتے ہیں، دوسرے لوگ اسے پورا کرتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ منافع اپنی جیب میں اتار لیتے ہیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ مقدار میں لوہا انگلستان اور دوسرے ملکوں کو روانہ کر دیتے ہیں اور وہ لوگ اسی لوہے سے فولاد اور فولاد کا سامان تیار کرکے یہاں بھیج دیتے ہیں!

یقیناً یہ بڑی غلطی ہے۔ ہندستان میں لوہا دفن رہے اور، ہم غیر ملکوں سے فولاد اور مشینری خریدیں! دوسری قومیں ایسی بیوقوف نہیں ہیں۔ جرمن ۳۰ لاکھ ٹن لوہا سالانہ اپنے ملک میں نکالتے ہیں اور تھوڑا لوہا فرانس اور سویڈن سے خرید کر ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ ٹن فولاد تیار کرتے ہیں۔ ہم بھی بیس لاکھ ٹن لوہا نکالتے ہیں لیکن افسوس کہ دس لاکھ ٹن سے بھی کم فولاد تیار کرتے ہیں۔

اِس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ
ہم ہندُستانی دھات کی تیّاری سے
ناواقف ہیں۔ دہلی میں کوئی پندرہ
سو سال پُرانی ایک لوہے کی لاٹ
موجُود ہے اور سُلطان گنج میں بُدھا
کا ایک بہُت بڑا بُت نصب ہے
جو کانسی کا بنا ہُوا ہے۔ اِن تمام
چیزوں کو دیکھنے سے پتا چلتا ہے
کہ صدیوں پہلے جب ہندُستان کے
لوگ دھات کی بڑی بڑی چیزیں
تیّار کرتے تھے، اُس وقت یوُرپ
کے لوگ فولاد سے تلواریں اور
چاقو بنانے کے سِوا اور کچھ نہیں
جانتے تھے!



کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم اپنے حیرت انگیز لوہے کے ذخیروں سے فولاد کی اُتنی مِقدار بھی نہ بنائیں جتنی کہ جرمنی کے لوگ بنا لیتے ہیں۔ جرمنی تو ہمارے مُلک کے مُقابلے میں بہُت چھوٹا مُلک ہے اور وہاں لوہا بھی ہمارے مُلک کے مُقابلے میں اِتنا کم ہے کہ اُنھیں سویڈن اور فرانس سے خریدنا پڑتا ہے۔ اِن تمام باتوں سے میرا یہ مطلب ہے کہ جمشید پور کے کارخانے کو ہمیں کئی گُنا زیادہ بڑھانا پڑے گا۔

بیشک ، تھوڑا بہت کام تو ضرور ہو رہا ہے مگر یہ کافی نہیں ہے ۔ حال میں ایک بھٹّی بنائی گئی ہے جو ایک ہزار ٹن فولاد روزانہ تیار کرتی ہے ۔ اِس وقت وہاں پانچ بھٹّیاں ہیں ۔ ابھی معلوم ہُوا ہے کہ وہاں ایک اور نئے قِسم کی مشین لگائی گئی ہے ۔ جس میں "ایسڈ" اسٹیل ('acid' steel) تیار کیا جائے گا ۔ ایک اور نئے قِسم کی مشین نصب کی جا رہی ہے جس سے بجلی کی قوّت پیدا کی جائے گی ۔ اِس اضافے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ٹاٹا کا کارخانہ دو سال کے بعد بجائے دس لاکھ ٹن کے سَوا دس لاکھ ٹن فولاد سالانہ تیار کر سکے گا ۔ کیا تمھیں اطمینان ہوا ۔ میں تو اِس سے مُطمئن نہیں ہُوا ۔ یاد رکھو کہ جرمنی دو کروڑ تیس لاکھ ٹن فولاد سالانہ تیّار کرتا ہے !

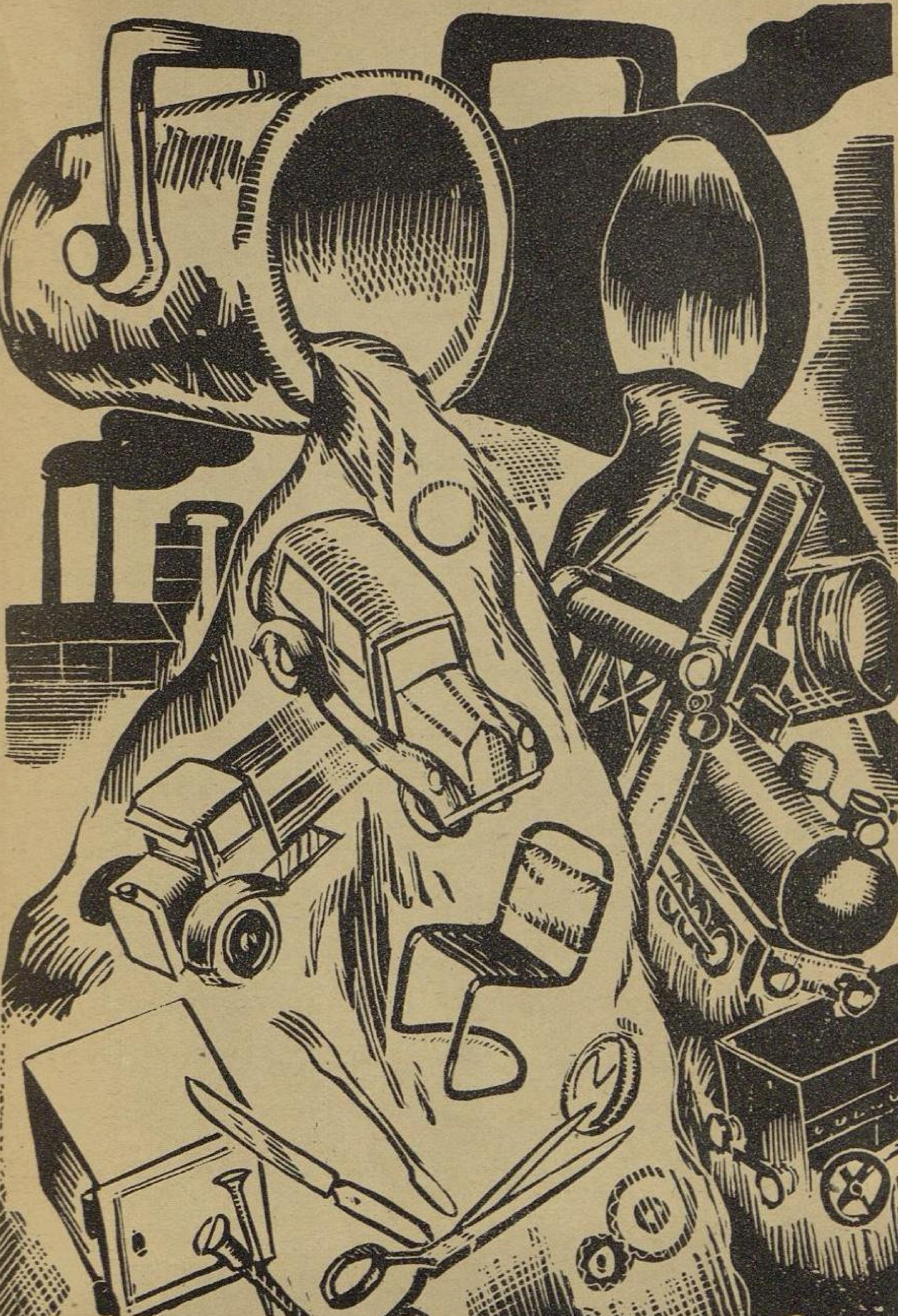
فرض کرو کہ اگر چند سال کے بعد بہت زیادہ مِقدار میں فولاد تیّار ہونے لگے تو پھر ہم اُس سے کیا کام لیں گے ؟ ہم اُس سے مشینیں بنائیں گے ۔ ایسی مشینیں جو برقی یعنی بجلی کی قوّت پیدا کرتی ہیں ، ایسی مشینیں جو کارخانوں میں چلائی جاتی ہیں ، ایسی مشینیں جو ریل کے اِنجن ، موٹریں ، جہاز ، ہوائی جہاز ، بائیسکلیں اور ٹریکٹر وغیرہ چلاتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی چیزیں مثلاً : کُلھاڑیاں ، پیچ ، ہتھوڑے بولٹ اور الپنیں بناتی ہیں ۔ جو اِس قِسم کی مشینیں تیار کرتے ہیں ایسے کارخانوں کو "انجنیرنگ ورک شاپ" یعنی "آلاتی کارخانے" کہتے ہیں ۔

کیا اِس وقت ہم کوئی ایسی چیز بنا سکتے ہیں ؟ کیا اِس وقت

ہمارے پاس ایسا کوئی کارخانہ ہے ؟ شاید ہی ہو۔ ٹاٹا کے کارخانے میں ایک زراعتی شعبہ ہے اور وہ "ایگریکو" کے نام سے مشہور ہے۔ اُس میں ساڑھے تین لاکھ کلہاڑیاں، ڈیڑھ لاکھ ہتھوڑے اور نو لاکھ کدالیاں سالانہ تیّار ہوتی ہیں اور اب اُس میں ریل کے پہیے اور دُھرے بنانے کے لیے مشینیں لگائی جا رہی ہیں۔ اِس کے عِلاوہ چند اور چھوٹے موٹے کارخانے ہیں اور بس، اللہ اللہ خیر سلّا !

اب بتاؤ کہ فولاد سے یہ مشینیں ہم کہاں اور کِس طرح بنا سکتے ہیں ؟ اِس سُوال کا جواب بعض ماہرین نے دِیا ہے جو ایک زمانے سے اِسی اُدھیڑ بُن میں لگے ہوئے ہیں۔ اُن کا یہ کہنا ہے کہ تمام مشین سازی کے کاموں کو دو بڑے کارخانوں میں تقسیم کر دِیا جائے۔ اُن میں سے ایک کارخانے میں تو بڑی بڑی مشینیں تیار کی جائیں ؛ جیسے کہ بائیلر (boilers) ریلوے اِنجن اور ڈبے وغیرہ۔ دُوسرے میں چھوٹی موٹی چیزیں بنائی جائیں ؛ جیسے ٹریکٹر، بسیں، زراعتی کام کی مشینیں، فولادی سامان، چاقو، چھُری اور کانٹے وغیرہ۔ اِس طرح ایک کارخانہ تو بھاری سامان تیار کرے گا اور دُوسرا ہلکا سامان بنائے گا ۔

ایسے کارخانے کہاں بنائے جائیں گے ؟ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ بھاری سامان بنانے کے لیے جمشید پور کے نزدیک بِہار میں کارخانہ بنانا چاہیے۔ اِس کی وجہ تو تُم سمجھ گئے ہوگے ؟ اِس قسم کے کارخانے کے لیے فولاد نہایت ضروری اور اہم چیز ہے۔ ایسا کارخانہ جمشید پور



سے جتنا نزدیک ہوگا اُتنا ہی فولاد کے لانے اور لے جانے میں کم خرچ بیٹھے گا ۔

اچھّا تو ہلکے سامان بنانے کا کارخانہ کہاں قائم کیا جائے؟ بمبئی میں۔ کیا اس کی وجہ بتا سکتے ہو؟ دیکھیں تمھاری راے ماہرین کی راے کی تائید کرتی ہے یا نہیں۔ بمبئی میں پانی بکثرت ہے اور برقی قوّت بھی سستی ہے جو ٹاٹا کے پن گھر (waterworks) میں تیّار ہوتی ہے بمبئی میں سال کے بارہ مہینے موسم مُعتدل رہتا ہے۔ پھر کسی موٹر کار یا جہاز کے چھوٹے موٹے پُرزے یورپ اور امریکہ سے منگوانا پڑیں تو کیا بمبئی ہندُستان کا دروازہ نہیں ہے؟ اِس کے عِلاوہ بمبئی موٹر کاروں، کشتیوں کی ہی منڈی نہیں ہے بلکہ احمدآباد اور قُرب و جوار کے گرنیوں کی مشینری کی بھی منڈی ہے ۔

اِس قسم کے آلاتی کارخانوں کا مُستقبل نہایت ہی روشن ہے اور ہمیں یقین ہے کہ یہ کارخانے سامان تیّار کرنے میں رات دِن مصروف رہیں گے اور دِن دونی رات چوگنی ترقّی کریں گے۔ اِس میں شک نہیں کہ اب اِن کی سخت ضرورت ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری روزانہ کے استعمال کی چیزیں ہندُستان ہی میں اچھّی اور سستی بنیں تو اُن کے تیّار کرنے کے لیے مشینیں چاہئیں؛ مگر لُطف یہ ہے کہ اِن مشینوں کو تیّار کرنے کے لیے دُوسری مشینیں درکار ہیں جو آلاتی کارخانوں میں ہوتی ہیں۔ جہاں کہ مشینیں ہی مشینیں بناتی ہیں ۔

بارھواں باب

"ہندوستاں ہمارا"

"بھئی واہ، خوب خیالی پُلاو پکائے!" میں سمجھتا ہوں کہ اِس کتاب کے پڑھنے والوں کے دِل میں شاید یہ خیال گزرا ہوگا۔ اُپلے نہ جلاؤ! ساجھے کی کھیتی کرو! بدیشی کپڑا مت پہنو! کچ دھات سے زیادہ سے زیادہ فولاد بناؤ! تمام مُلک میں بجلی دوڑاؤ! جن مشینوں کی ضرورت ہو اُنھیں یہیں بناؤ! یہ کرو، وہ کرو۔ اور پھر دیکھو کہ ہندُستان جنّت کا نمونہ بن جاتا ہے۔ تُم کہوگے کہ یہ سب کچھ ٹھیک ہے مگر یہ تو بتاؤ کہ آخر یہ تمام کام کرے گا "کون"؟ کون! ہاں بے شک، یہ تو تُم نے دُکھتی ہوئی رگ دبا دی ۔

یہ بات اگر تُم مجھ سے پُوچھو تو میرا جواب ہوگا "تُم" ہاں تُم میرے نوجوان بھائیو! تُم اور میری پیاری بہنو! تُم۔ اِس گتھی کو صرف تُم ہی سُلجھا سکتے ہو جس سے ہماری کتاب کی ابتدا ہوتی ہے۔ صرف تُم ہی اس کی ایک خوبصورت تصویر بنا سکتے ہو۔ کچھ بھی ہو یہ تمھارا ہی تو مُلک ہے۔ آج نہیں تو کل ہو جائے گا —— اب بتاؤ "تُم" نہیں کروگے تو پھر کون کرے گا؟

تم کہوگے کہ ہم یہ کیسے کریں؟ تو بھئی دُنیا کے دُوسرے لوگ، اپنے کام کِس طرح چلاتے ہیں۔ ریلیں دوڑاتے ہیں، خط پتّر لاتے لے

جاتے ہیں، آبپاشی کرتے ہیں اور اپنے مُلک کی درآمد و برآمد کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں۔ یہ سب کام حکومت کے ذریعے ہوتے ہیں۔ حکومت ایک قسم کی مشین یا آلہ ہے وُہ یہ سب کام کرتی ہے۔ یا یہ کہو کہ اُسے کرنا چاہیے۔ کیونکہ اکثر ایسا نہیں ہوتا جو ہم اور تم چاہتے ہیں یا وُہ سب لوگ چاہتے ہیں جو اِس مُلک میں رہتے ہیں ۔

بدقسمتی سے، حکُومتیں آہستہ آہستہ وہی کام کرتی ہیں جِس کا لوگ مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر کسی مُلک کی رعایا کاہل اور لاپروا ہو تو وہاں کی حکومت بھی اُسی طرح کی ہو جاتی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ "ہر قوم کی حکومت بھی ویسی ہی ہوتی ہے جس کی کہ وُہ مستحق ہے۔" اب تُم نے دیکھ لیا کہ حکومت کا اِنحصار کِس حد تک باشندوں پر ہے۔ اب کہو، تُم کِس قِسم کی رعایا بننا چاہتے ہو؟ تُم اپنے مُلک کے متعلق کیا جانتے ہو اور اُس کے مسائل سے کِتنی واقفیت رکھتے ہو؟

اِس چھوٹی سی کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ تمُھیں یہ تمام باتیں سمجھنے میں آسانی ہو۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ تُم نے اِس سے کیا سیکھا لیکن جو کچھ میں نے سیکھا ہے وُہ میں تمھیں بتاؤں گا ——

ہم ہندُستانی بڑی بے وقوفی سے اپنا مال و دولت برباد کر رہے ہیں۔ اِس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے مُلک کی زِندگی کا کوئی نظام نہیں بنایا ہے۔ ہماری زِندگی اوٗٹ پٹانگ ہے۔ ہماری تو یہ کیفیت ہے کہ ؎

صبح کرتے ہیں شام کرتے ہیں عمر..یوُں ہی تمام کرتے ہیں

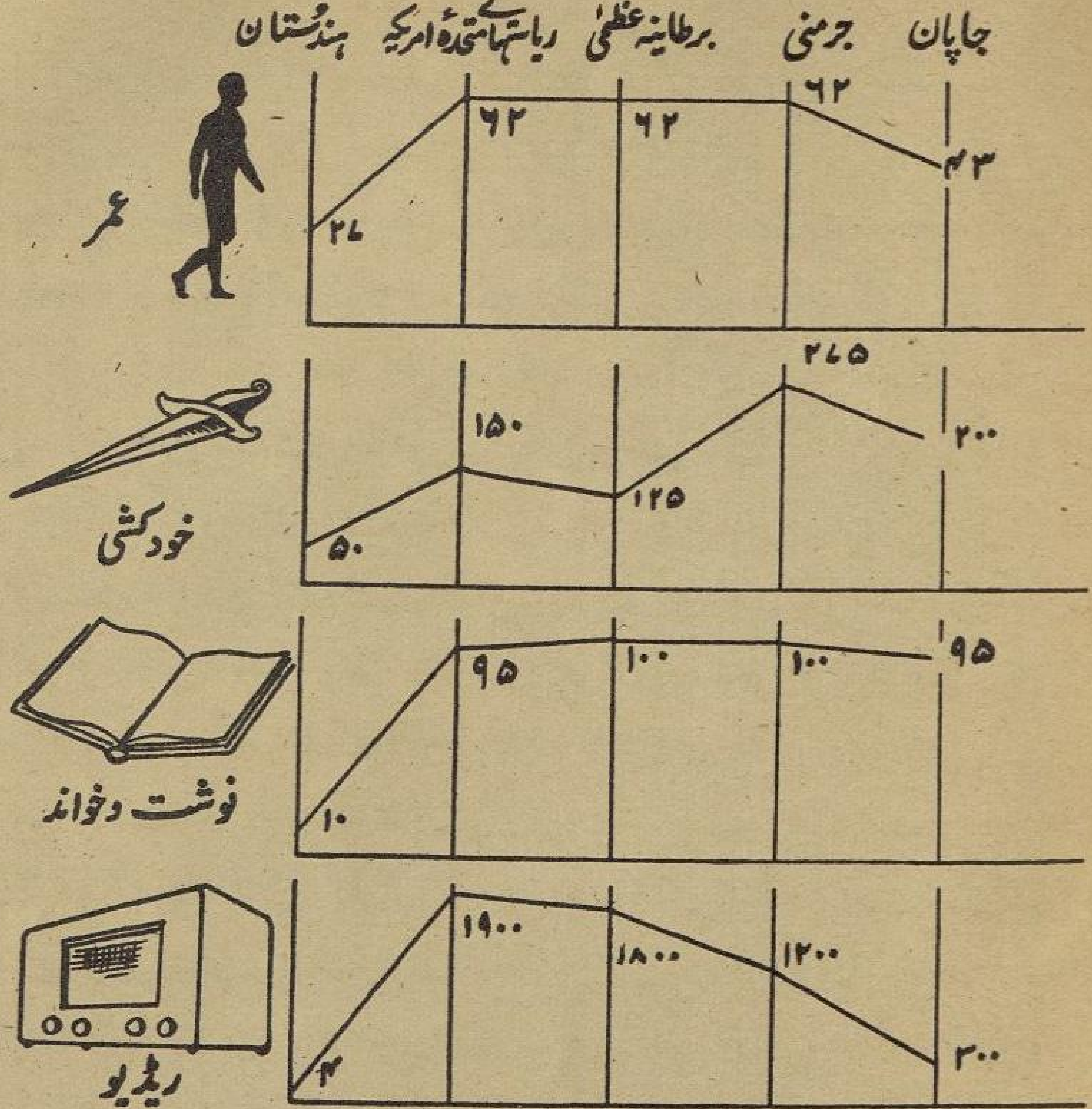
اور تُم نے دیکھ لیا کہ ہم نے اپنے آپ کو کِن کِن مُصیبتوں میں پھنسا دیا ہے ۔

جب ہمارے مطلب کی حکومت ہوگی تو سب سے پہلے وُہ ایک نظام ترتیب دینا شروع کرے گی جس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ آج کل جو خرابیاں ہم دیکھتے ہیں وُہ رُک جائیں گی اور ہمارے مُلک اور اہلِ مُلک سے فائدے کے کام لیے جائیں گے۔

اِس قسم کے نظام کی تیاری اور اُس کے چلانے کے لیے برسوں لگتے ہیں۔ ایسے نظام کی تیاری کے لیے کوششیں ہو رہی ہیں۔ نیشنل پلیننگ کمیٹی جس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو ہیں ایسا کام کر رہی ہے۔ اِس کمیٹی کے رُکن مرد اور عورتیں ہیں جو ماہرِ سیاست ہیں، ماہرِ تعلیم ہیں، ماہرِ صنعت و حرفت ہیں، سائنس دان ہیں اور انجینیر ہیں۔

کِسی نظام کے بنانے والوں کو جو مُشکلات پیش آتی ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ وُہ تمام ضرُوری چیزوں کو ایک ہی وقت میں نہیں کر سکتے۔ ہر بڑی تبدیلی جو کہ ضروری ہوتی ہے، اُس کے لیے روپیہ اور ہمت چاہیے۔ مگر افسوس ہے کہ ہندُستان میں اِن دونوں کی کمی ہے۔ جس کے باعث تمام کام ایک وقت میں نہیں ہو سکتے تُم ایک ہی سال میں "یہ" اور "وہ" نہیں کر سکتے اور یہی سُوال ہر وقت پیش آتا ہے —— کہ ہم پہلے یہ کریں یا وُہ؟

نظام بنانے والوں کو یہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ وُہ کِس قسم کی زِندگی یا سوسائٹی چاہتے ہیں۔ ایک نظام کی ضرُورت سب مانتے ہیں لیکن نظام کا مقصد کیا ہے؟ کیا ایسے ہندُستان کے لیے جس میں بڑے بڑے شہر ہوں یا چھوٹے شہر اور گانو؟ کیا ایسے ہندُستان کے لیے جس کے بڑے بڑے کارخانوں میں مزدُوروں کی فوجیں ہوں یا جھونپڑوں



عمر : اِس تصویر میں اِنسان کی اوسط عُمر سالوں میں بتائی گئی ہے ؛

خودکشی : اِس تصویر میں جو عدد درج ہیں وُہ ہر دس لاکھ آدمیوں میں خودکُشی کی تعداد ظاہر کرتے ہیں ؛

تعلیم : بالغوں کی فی صد تعداد ظاہر کی گئی ہے ؛

ریڈیو : ہر دس ہزار آدمیوں میں ریڈیو سیٹ کی تعداد ظاہر کی گئی ہے ؛

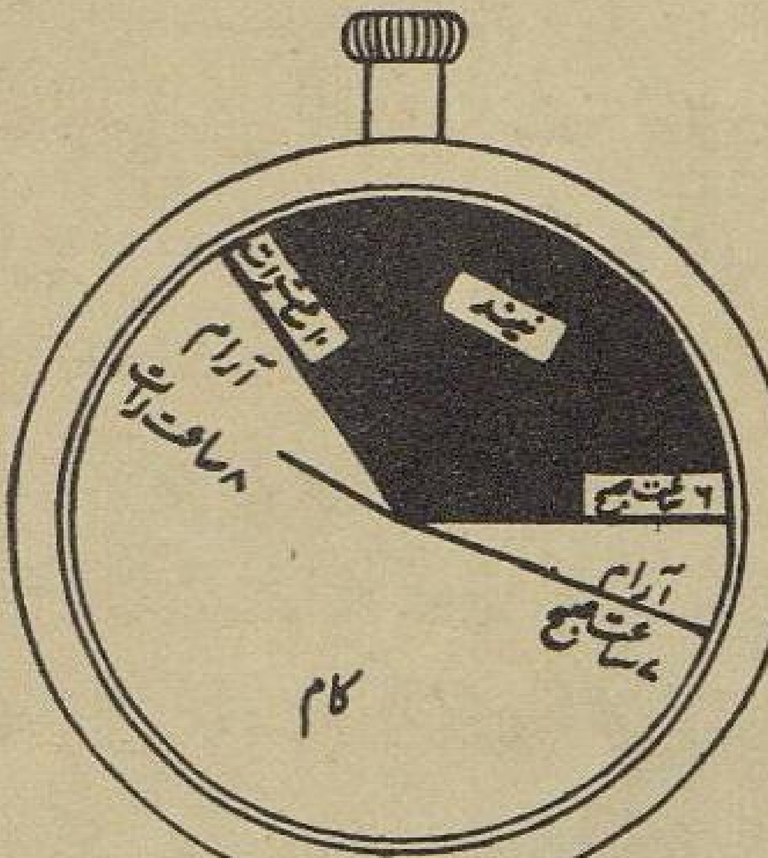
میں کاریگروں کے خاندان ؛ یا ایسے ہندُستان کے لیے جس میں بڑے بڑے اتّحادی یعنی ساجھے کے کھیت ہوں گے یا کسانوں کے چھوٹے چھوٹے ذاتی کھیت ؛ اِن سُوالوں کا جواب کِتنا مُشکل ہے۔ ہے کہ نہیں ؛ تاہم صفحہ ۱۸۷ پر ایسی تصویر دی گئی ہے جو کہ ہندُستان کی زِندگی کے حالات کو ایسے مُلکوں سے مقابلہ کرتی ہے جہاں بُہت زیادہ صنعتی ترقّی ہو چکی ہے۔ شاید یہ تم کو جواب بتانے میں مدد دے ؟

اکثر نوجوان جو امریکہ، جرمنی اور اِنگلینڈ کی حیرت انگیز مشینوں کو تعجّب سے دیکھتے ہیں، اُن کی خواہش ہے کہ ہندُستان میں بھی ایسے ہی بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں قائم کر دی جائیں۔ اِسی طرح بڑے بڑے سرمائے دار بھی یہی چاہتے ہیں کہ مزدُوروں کو کارخانوں میں لگاکر خُوب مُنافع کمائیں۔ برخلاف اِس کے ایسے لوگ بھی ہیں۔ اور اُن میں سے ایک مہاتما گاندھی ہیں۔ جو اِس قِسم کے امکانات سے نفرت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ لوگ اپنی ضروریات کی تمام چیزیں اپنے گھر ہی میں بنا لیا کریں ؟

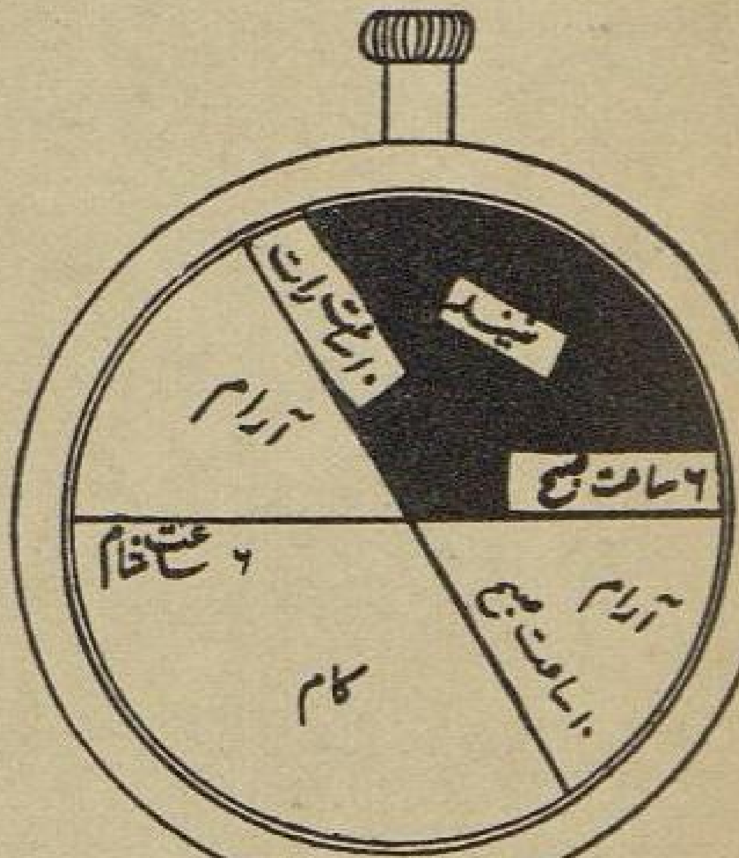
مگر ہمارے کارخانے والے دوست پُوچھتے ہیں "اگر ہمارے پاس لوہے اور فولاد کے بڑے بڑے کارخانے نہیں ہوں گے تو ہم جنگ کے لیے ہتھیار کیسے تیار کریں گے ؟"

"لیکن ہم تو کسی سے لڑنا نہیں چاہتے ! اگر کوئی ہمارے مُلک پر حملہ کرے، تو ہم اہنسا سے مقابلہ کریں گے" دیہات کو واپس چلو کہنے والے لوگ یہ جواب دیتے ہیں ؟

روشن خیال آدمی (Modernist) یہ کہتے ہیں "اگر ہمارے پاس مشینیں ہوں تو ہمیں زیادہ کام نہ کرنا پڑے گا ؛ ہمیں آرام و آسایش کے لیے تھوڑا بہت وقت مل جائے گا اور ہم دُنیا کا لُطف اُٹھا سکیں گے"۔



مشین بغیر



مشین سے

دوسرا مُنہ بنا کر کہتا ہے "آرام خوفناک چیز ہے اور اِس کا نتیجہ بداخلاقی ہوتا ہے - یہ یاد رکھو کہ بے کاری میں شیطان بہکاتا ہے"
روشن خیال ہنس کر کہتا ہے "اگر یہی بات ہے تو پھر چرخے اور ہل کو بھی کیوں نہ چھوڑ دیا جائے تاکہ دِن بھر، چوبیس گھنٹے، محض زندہ رہنے کے لیے ہم صرف ہاتھوں ہی سے کام کرتے رہیں"۔
دیہات کو واپس چلو کہنے والے کہتے ہیں "ابھی لوگوں میں اِتنی سمجھ نہیں آئی کہ وہ بڑی بڑی مشینوں سے کام لیں ؛ اُن کے استعمال سے وُہ کہیں مشینوں کے دست نگر نہ ہو جائیں اور اِس کا بھی ڈر ہے کہ کہیں وہ روبوٹ (robots) یعنی کل کے آدمیوں کی طرح،

ایک قالبِ بے جان کی صورت مشینوں پر ہی زندگی نہ بسر کرنے لگیں۔ اِس کے علاوہ مشینوں سے بے روزگاری بڑھتی ہے، اور سرمائے دار جو مشینوں کے مالک ہیں وہ مزدوروں کو دھوکے دیتے رہتے ہیں۔"

اِس کے برخلاف مشینوں کے شیدائی کہتے ہیں کہ وُہ آدمی ہی ہے جو مشین کو قابو میں لایا، وُہ انسان کو بہت کچھ خراب اور غلط کام کرنے سے بچاتی ہے اور دِن بھر زیادہ کام کرنے کے بعد زیادہ مزدوری دِلاتی ہے۔ مشین سے نسبتاً سستی چیزیں بنتی ہیں جنھیں غریب غُربا بھی خرید سکتے ہیں ورنہ وُہ بے چارے مُنہ تکتے رہ جاتے۔ اب رہا بے روزگاری اور دھوکے بازی کا سُوال، تو اُس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ گِنتی کے چند سرمایے دار اپنے ذاتی مُنافع کے لیے مشینیں چلا رہے ہیں۔"

اسی طرح بات میں بات پیدا ہوتی چلی جاتی ہے اور دونوں پہلوؤں پر اِس قدر کہا جا سکتا ہے کہ ایک اچھی خاصی کتاب تیار ہو سکتی ہے! مباحثوں میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ دونوں میں کچھ نہ کچھ سچائی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ خود مہاتما گاندھی نے کہا تھا: "مجھے مشین پر اِتنا اعتراض نہیں ہے جتنا کہ مشین کے دِیوانوں پر..... چرخے کا پہیا خود مشین کا ایک عُمدہ پُرزہ ہے۔"

اکثر لوگ یہ بات بھُول جایا کرتے ہیں کہ سائنس کی اور ایجادوں کی طرح مشین میں بھی نہ اچھائی ہے اور نہ بُرائی۔ وُہ غیر جانب دار ہے۔ ایک طیارہ بم گرا کر لوگوں کی جانیں لے سکتا ہے۔

وُہ دُور دراز مقام پر طبیب یا دوا کو بر موقع پہنچاکر جان بھی بچا سکتا ہے۔اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم مشین سے جیسا بھی چاہیں کام لیں۔تو اس کا حل



یہ ہے کہ مشین کو توڑا نہ جائے بلکہ آدمیوں کو اُس کا صحیح اور عمدہ استعمال سِکھایا جائے۔

اِس کے عِلاوہ جہاں تک ہندُستان کا تعلق ہے ،میرا خیال ہے کہ ہم کو اِس معاملے میں زیادہ جوش و خروش نہ دِکھانا چاہیے یا اِس بات کی فِکر نہ کرنا چاہیے کہ ہمارا مُلک کارخانوں اور مشینوں کا مُلک ہو جائے گا۔ہمیں یہ نہ بھُولنا چاہیے کہ سو ہندُستانیوں میں سے بہتّر کھیتی باڑی کرتے ہیں اور نوّے دیہات میں رہتے ہیں۔ بیس لاکھ آدمیوں سے کم کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ اگر ہم نہایت تیزی کے ساتھ بھی بڑے پیمانوں پر صنعتیں قائم کر دیں تو کوئی فِکر کی بات نہیں۔کیونکہ ہماری آبادی اِس قدر تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ دس سال کے بعد اگر خود ہمارے کارخانوں میں موجُودہ تعداد کے عِلاوہ دو کروڑ آدمیوں کے کھپانے کی قابلیت ہو گی تب بھی چالیس کروڑ آدمی کاشت کے لیے باقی رہ جائیں گے !

اِس لحاظ سے ہندُستان چاہے کِتنی ہی تیزی سے ترقّی کرے وُہ ایک زراعتی مُلک ہی رہے گا۔ وُہ مُلک جس میں کِسان اور کاریگر ہوں گے نہ کہ شہروں میں مزدُور۔

ہم ہندُستان کے لیے ایک ایسا نظامِ عمل چاہتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ اِنسانی قُوّت کو مُفید کاموں میں لگائے اور زیادہ سے زیادہ پیداوار میں اضافہ کرے۔ میرا خیال ہے کہ اِس کا ضابطہ یہ ہونا چاہیے، زیادہ سے زیادہ روزگار + زیادہ سے زیادہ پیداوار۔

کیا اِس سے یہ مطلب ہے کہ اب ہمیں صنعتی مسائل کو سُلجھانے کی ضرورت نہیں؟ نہیں، بلکہ اِس سے یہ مطلب ہے کہ زراعت پیشہ آبادی میں آئندہ جو پریشان کُن اضافہ ہوگا اُسے کھپانے کے لیے ہندُستان میں صنعت پھیلانے کا کام ہم جلد سے جلد اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ لیکن اِس سے یہ مطلب بھی ہے کہ جب دس سال کے بعد بھی شہروں کے بڑے بڑے صنعتی کاموں میں چھ فیصدی آدمی بھی جذب نہیں ہو سکتے تو ضرورت ہے کہ ہماری چھوٹی چھوٹی صنعتیں ہمارے دیہات میں رہیں اور گانو کھیڑوں میں یہ چیزیں تیّار ہوں۔ اِس طرح وُہ لوگ جنھیں کھیتی باڑی کے لیے زمین نہیں ہے وُہ وہیں بیٹھے ہوئے دُوسرے کام انجام دے سکتے ہیں۔ جن کسانوں کو فصلیں کٹنے کے بعد کوئی کام نہیں، فرصت کے زمانے میں اُنھیں کوئی نہ کوئی دستکاری مِل جائے گی اور وُہ لوگ جن کی کھیتی باڑی یا زراعت کے کاموں میں بالکل مانگ نہیں وُہ اپنا پُورا وَقت مُختلف قسم کی دیہی صنعتوں میں صرف کر سکتے ہیں۔

بیسیوں قسم کی دیہی صنعتیں ہیں۔ آج کل "چرخے" سے رُوئی کاتنے اور کرگے سے کپڑا بُننے کی صنعت بُہت عام ہے۔ خواہ وُہ سُوتی کپڑے ہوں یا ریشمی یا اُونی۔ اِس وقت لاکھوں آدمی یہ



کام کر رہے ہیں۔

ان کے علاوہ ہر قسم کی اور صنعتیں بھی ہیں جو صدیوں سے ہندستان میں رائج ہیں اور مشین کے بنے ہوئے سامان کے مقابلے کے باوجود اب تک زندہ ہیں۔ مثلاً: مختلف قسم کی دھاتوں کی صنعت۔ گانو کے لوہار بھی ہیں جو لوہے کا کام کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ بڑے مشّاق کاریگر بھی ہیں جو پیتل، تانبے اور چاندی سونے کی چیزیں بناتے ہیں اور باورچی خانے کے برتنوں سے لے کر عمدہ سے عمدہ زیور تک تیار کرتے ہیں۔

بعض لوگ ہاتھی دانت اور سنگِ مرمر کا کام کرتے ہیں اور بعض قالین بُنتے ہیں۔ پھر مختلف قسم کے چوبی کام بھی ہیں؛ یعنی کشتی اور فرنیچر سے لے کر بچّوں کے چھوٹے چھوٹے کھلونے تک تیار کیے جاتے ہیں۔ بید سے ٹوکریاں بنائی جاتی ہیں۔ چکنی مٹّی سے کمھار برتن وغیرہ بناتے ہیں۔ جانوروں کی کھالیں چمڑا رنگنے والوں اور جوتے بنانے والوں کو مصروف رکھتی ہیں۔

بیجوں سے تیل نکالتے ہیں اور تیل سے صابن تیار کرتے ہیں۔ گنّے کے رس سے گڑ بناتے ہیں۔ دھان ہاتھوں سے کوٹ کر چاول نکالتے ہیں۔ اور ان چاولوں میں مشین سے نکلے ہوئے چاولوں سے زیادہ غذائیت ہوتی ہے۔ میوے محفوظ کیے جاسکتے ہیں۔ روشنائی ہاتھ سے بنائی جا سکتی ہے اور اسی طرح کاغذ بھی ہاتھ سے تیار کیا جا سکتا ہے۔ نیپال[1] میں جو دستی کاغذ بنتا ہے وہ ہزارہا

[1] ریاست حیدرآباد دکن اور کشمیر میں ہاتھ سے کاغذ بنایا جاتا ہے اور اب تک رائج ہے۔ (مترجم)

سال تک خراب نہیں ہو سکتا۔

جو لوگ شیر خانے یعنی ڈیری اور مُرغی خانے قائم کرنا چاہیں تو اُن کے لیے گائیں، بھینسیں، بکریاں اور مُرغیاں موجود ہیں۔ شہد کی مکھیوں کی پرورش بھی ایک نفع بخش پیشہ ہے۔ جب کہ یہاں یہ تمام دیہی صنعتیں موجود ہیں تو پھر ہمارے کسان اِن کی طرف کیوں توجہ نہیں کرتے اور پھر کاریگر اس قدر گری ہوئی حالت میں کیوں ہیں؟

بات یہ ہے کہ اِن کو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ سرمایہ، ہُنرمندی اور منڈی۔ ہمارے گانو کے بہت لوگ تو اِتنے غریب ہیں کہ وُہ خام اشیا تو رہیں ایک طرف کام کرنے کے لیے معمولی دستی اوزار بھی نہیں خرید سکتے۔ اِن کی ہنرمندی بہت ہی معمولی ہے اور اُن کا مذاق اگرچہ فطرتاً اچھا ہے مگر دقیانوسی ہے۔ پھر جو سامان کہ وُہ بناتے ہیں، اُنھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ اُسے کہاں اور کس طرح بیچیں۔

اگر اِن چھوٹی صنعتوں کو کامیاب بنایا جائے اور اُنھیں عام طور پر رائج کر دیا جائے تو اُن لوگوں کو اپنے پانو پر کھڑا کرنے کے لیے بہت مدد دینے کی ضرورت ہے۔ پھر حکومت کو یا تو خود یا انجمنِ امدادِ باہمی کے ذریعے اِن دیہی صنعتوں کے لیے روپیہ قرض دینا پڑے گا یا اِس سے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ حکومت خام اشیا فراہم کرکے کاریگروں کو مہاجنوں کے پنجوں سے چھڑائے۔

دُوسرا کام یہ ہے کہ جا بجا صنعتی ادارے (technical institutes) اور مدرسے کھولے جائیں جہاں نئے اوزار اور آلات ایجاد

کیے جائیں، نئے نئے نمونے بنائے جائیں اور ایسی ایسی ترکیبوں پر غور کیا جائے جس سے محنت بچے۔ پھر منتخب کاریگروں کو کام سکھایا جائے۔ یہ لوگ گانو گانو چکر لگا کر گانو والوں کو یہ بتائیں کہ اِن اوزاروں سے کیسے کام لیا جاتا ہے اور اِن سے بہتر سے بہتر چیزیں کیسے بنائی جاتی ہیں ؛

اِن چیزوں کے فروخت کا اِنتظام باضابطہ مارکٹنگ آفیسر کے عملے یا انجمنِ امدادِ باہمی کے سپرد ہونا چاہیے تاکہ کاریگروں کو اُن کے سامان کے معقول دام ملیں ؛

یہی وہ طریقے ہیں جن کی بدولت جاپان اور سوئٹزرلینڈ جیسے ملکوں میں اِس قسم کی صنعتیں نہایت تیزی سے پھیلیں اور مقبول ہوگئیں ؛

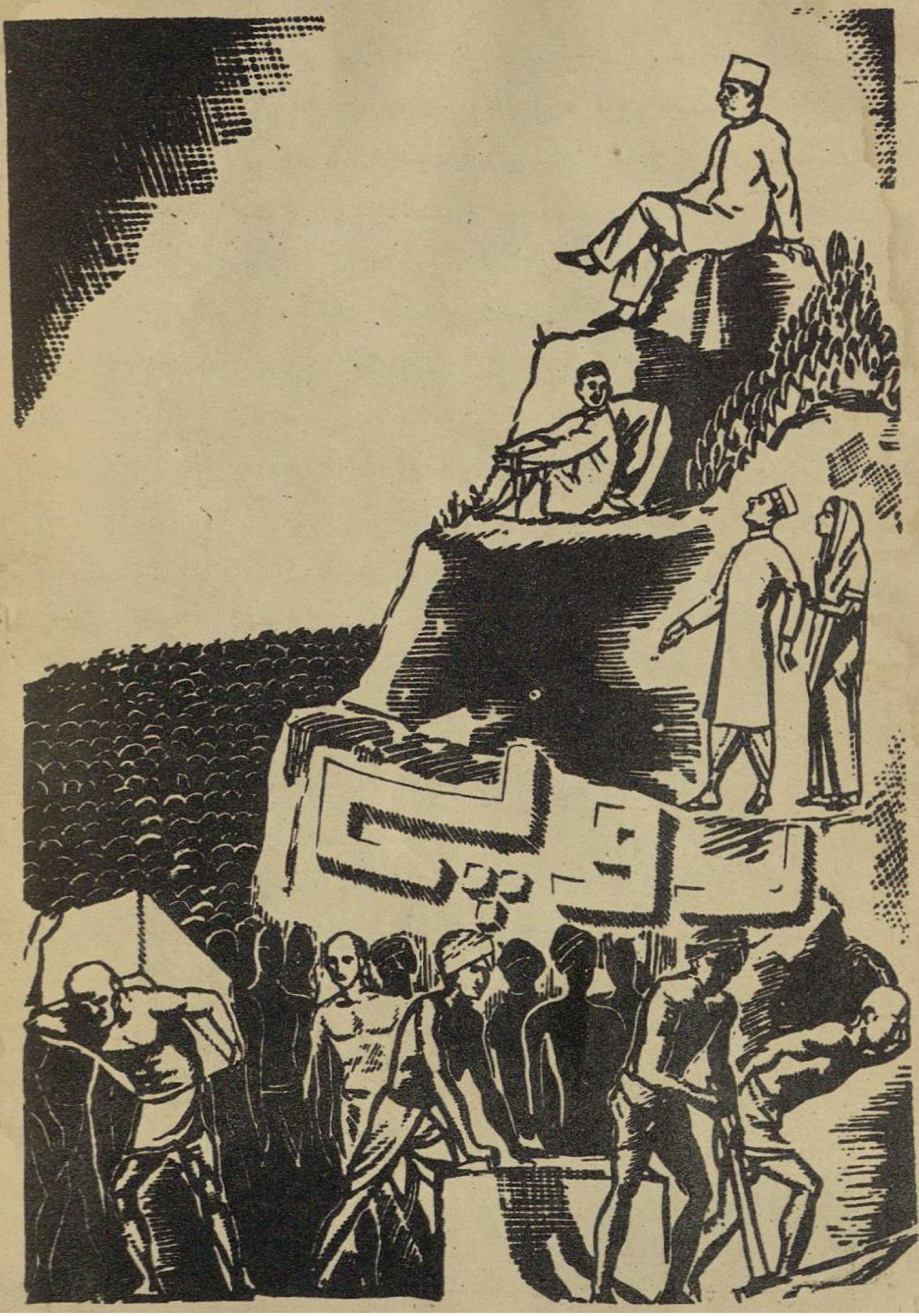
بعض موقعوں پر ہاتھ سے بہت سستی چیزیں بنائی جا سکتی ہیں۔ لیکن اُن کی قیمت اِتنی کم نہیں پڑتی جتنی کہ اُس حالت میں پڑتی ہے جب کہ وہ مشین سے بنائی جائیں۔ اِس کے لیے حکومت کو بڑی فیکٹریوں میں چھوٹی چھوٹی چیزیں بنانے کی ممانعت کر دینی پڑے گی یا اُن کی ایک تعداد مقرر کرنی پڑے گی ؛

اِس کے ساتھ ہی دیہی صنعتوں کو شہر کی بڑی صنعتوں سے چند ضروری چیزیں لینے کی ضرورت پڑے گی۔ مثلاً، اُنھیں بڑی انجینیرنگ ورکشاپ سے چھوٹی مشینیں، اور اچھے اوزار اور بڑے تجربے خانوں سے رنگ اور دوائیں لینے کی ضرورت ہوگی۔ اِس کے علاوہ بڑے بڑے آبی برقی کارخانوں سے اُنھیں سستی اور زیادہ مقدار میں بجلی لینے کی

ضرورت پڑے گی تاکہ اُس کے ذریعے سے وُہ اپنے اوزاروں کو تیزی سے چلا سکیں، کیونکہ ہاتھ سے اوزاروں کو تیزی سے نہیں چلا سکتے۔ اب دیکھو، گانو اور شہر میں کتنا زبردست بندھن ہے۔ ایک کے بغیر دُوسرے کا جیون محال ہے۔

کیا اِس سے یہ مطلب ہے کہ ہمارے لوگوں کی زندگی گنتی کے اُن بڑے کارخانے داروں کے ہاتھ میں ہوگی جو اُن کارخانوں اور فیکٹریوں کے مالک ہوں گے اور وُہ لوگ ہمارے لوگوں کی محنت سے فائدہ اُٹھائیں گے! اِس تصویر کو دیکھو اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندُستان میں آج چند آدمی بے حساب روپیہ کما رہے ہیں اور برخلاف اس کے، اکثر لوگ بہُت ہی کم کما رہے ہیں۔ تم نہیں دیکھتے، چند امیر آدمی پہاڑ کی بُلندی پر ہیں اور باقی نیچے وسیع میدان میں۔ اِس سے ہمیں ایک بہُت بڑے خطرے کا احساس ہوتا ہے۔ اب ہمیں یہ یقین کِس طرح ہو کہ یہ بڑے بڑے کارخانوں کے مالک اپنے اعلےٰ مرتبوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پر نہ پہنچیں گے۔

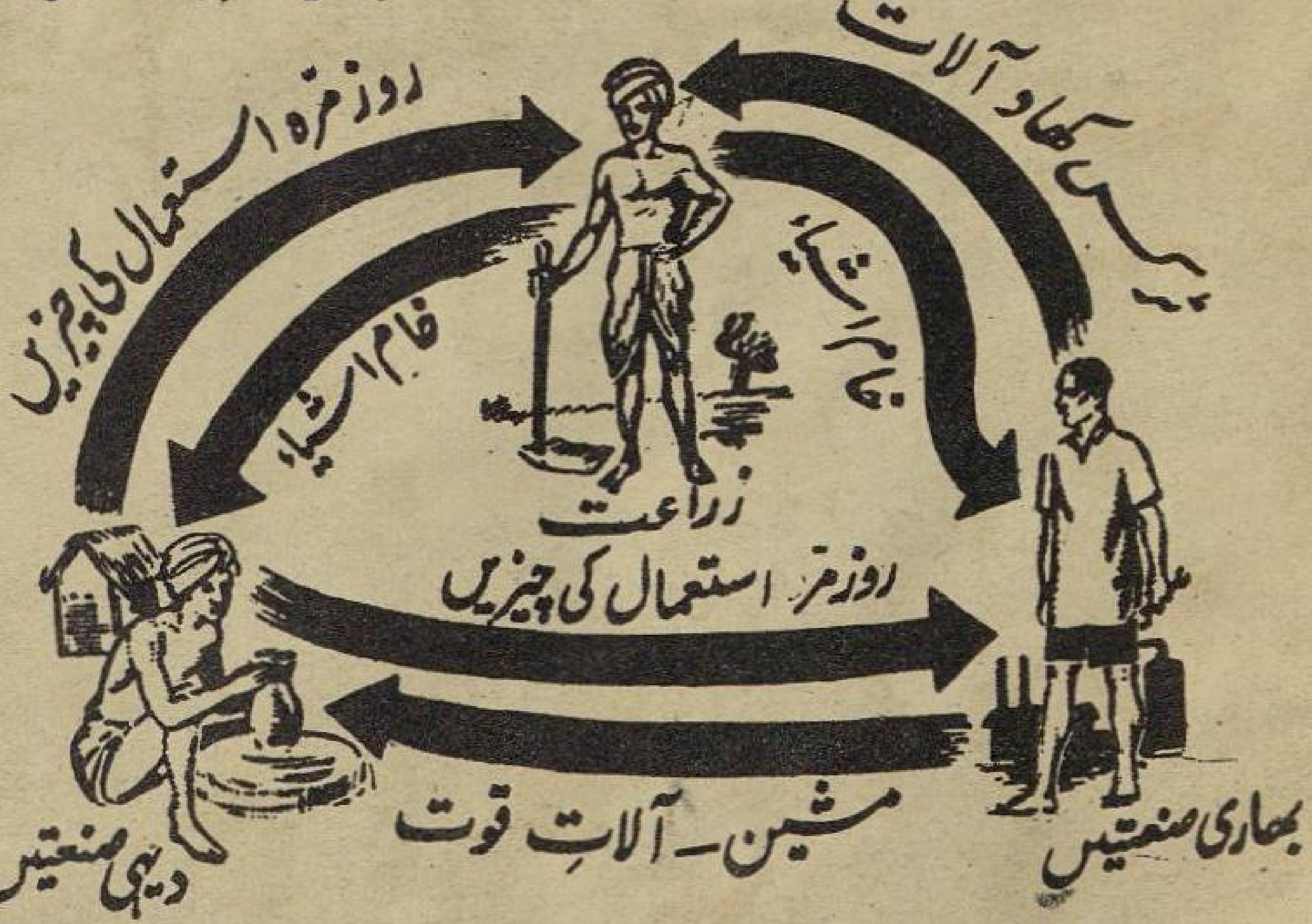
اِس کا جواب بالکل آسان ہے۔ یہ بڑی فیکٹریاں اور مشینیں کسی کے بھی ملکیت میں نہ رہیں۔ پھر اُنہیں چلائے گا کون؟ اپنی حکومت کے ذریعے ہم تُم اور سب مل کر چلائیں گے۔ بہر حال یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ ہم تاجروں سے خطوط رسانی کا کام نہیں لیتے۔ تم خود بولو، لیتے ہیں۔ کیا؟ یہ کام خود ہمارا ڈاکخانہ نہایت سُرعت اور خوش اسلوبی سے انجام دیتا ہے۔ آب رسانی کا کام، ہماری جانب سے



میونسپلیٹی یعنی بلدیہ کرتی ہے۔ اب ہندُستان کی ریلیں گورنمنٹ کا ریلوے بورڈ چلا رہا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بجلی کی فراہمی، لوہے، فولاد، مشین اور دواسازی کا کاروبار چند سرمایے داروں کے ہاتھ میں دے دیا جائے اور خود حکومت اُسے انجام نہ دے؟

ایسا کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بُنیادی صنعتیں یعنی ایسی صنعتیں جن پر دوسری صنعتوں اور لوگوں کی زندگی کا دار و مدار ہے قوم کے مُشترکہ قبضے میں رہیں اور قوم ہی کے فائدے کے لیے اُنھیں چلایا جائے۔

اِس لیے ہمارے آیندہ ہندُستان کی تصویر میں، بڑی صنعتوں کو ہندُستان کے تمام لوگوں کی ملکیت میں بتایا گیا ہے جو حکومت کے ذریعے سے ہوگی اور چھوٹی چھوٹی ہر ایک صنعت کا مالک ایک ہی شخص ہوگا یا وُہ گروہ ہوگا جو شاید انجمن اتحادِ باہمی کی طرح ہو۔ اِن دونوں



کے ساتھ ہندُستان کی سب سے بڑی صنعت یعنی زراعت ہے۔ اِس تصویر میں تُم دیکھتے ہو کہ شہر کی معاشی زِندگی میں اِن تینوں حصّے داروں میں سے ہر ایک ایک دوسرے کو اِس کا ضرُوری سامان مہیّا کرے گا۔

اب ہمارا فرض ہے کہ ہم کوشش کریں اور بالکل زراعتی مُلک جیسا کہ ہندُستان ہے —— جہاں رات دِن ہاتھ سے کام کرتے ہیں۔ اور بے حد صنعتی مُلک جیسا کہ اِنگلستان ہے —— جہاں رات دِن مشینیں چلتی ہیں۔ اِن دونوں قِسم کے حالات میں ایک توازن قائم کریں۔ ہمیں اور زیادہ صنعتوں کی ضرُورت ہے، لیکن اُنھیں گھر گھر پھیلائیں اور چھوٹے چھوٹے کارخانوں کا ایک جال تمام مُلک میں پھیلا دیں۔ اِس طریقے سے ہم اُن مُصیبتوں سے نجات پا جائیں گے جو مشینوں سے نازل ہوئی ہیں اور اُن سے پُورا پُورا فائدہ کما سکیں گے۔

غیر مُلکوں کے لوگوں کی طرح ہم بھی چاہتے ہیں کہ زیادہ اچھا کھائیں، زیادہ اچھا پہنیں اور زیادہ اچھّی چیزیں استعمال کریں۔ یہ اِس لیے ضروری نہیں کہ یہ زندگی کے لیے سب سے عُمدہ چیزیں ہیں بلکہ اِن کے استعمال سے مرد، عورت اور بچّوں کو اپنی زِندگی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے میں مدد مِلتی ہے اور وُہ دوُسروں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ ہمارے چاروں طرف ہندُستان کا ایک زبردست پھیلاؤ ہے اور ہم میں سے ہر ایک کے دِل میں بھی ہمارے ہندُستان کا ایک جُزو موجُود ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہمارے اطراف میں جو زمین ہے اُسے سرسبز و شاداب کریں تاکہ ہم اپنی پوشیدہ قُوتوں کو اُبھار کر ترقّی دے سکیں۔ ہمیں اپنے مُلک پر ناز ہے

اور ہم چاہتے ہیں کہ اُس کو بھی ہم پر تھوڑا بہت ناز ہو ؛

اب آؤ اور سب مل کر اپنے مُلک کے مشہور و معروف شاعر اقبالؒ کا ترانہ گائیں ؛

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بُلبلیں ہیں اُس کی یہ گلستاں ہمارا
پربت وُہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وُہ سنتری ہمارا وُہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اُس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جہاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا